علامہ اقبال اور مولانا محمد علی

مؤلفہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان ۱۸۰۸۶ کراچی ۳۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب : علامہ اقبال اور مولانا محمد علی

مولف : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ناشر : ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان
پی او بکس نمبر ۱۸۰۸۶ - کراچی ۳۳

طابع : المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ)
پاکستان چوک. کراچی

اشاعت : ۱۹۸۴ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : بیس ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ :
(۱) مکتبہ شاہد
علی گڑھ کالونی - کراچی ۴۱

(۲) پاک اکیڈمی
۲۲ جامع مسجد باب الاسلام، آرام باغ. کراچی

فہرست

دعا	علامہ اقبال	۶
مولانا محمد علی بہ حیثیت نقاد و ماہر اقبالیات	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	۷
علامہ اقبال اور مولانا محمد علی	〃 〃	۳۳
میرا استاد ـــــ اقبال	مولانا محمد علی	۸۳
طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ	〃	۹۳
شاعر وطن ـــــ اقبال	〃	۹۸
شاعر اسلام ـــــ اقبال	〃	۱۰۷
شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال	〃	۱۲۰

تہدیہ

سندھ کی مایۂ ناز، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی شخصیت

شاہ محمّد شاہ صاحب مدّظلہٗ

کی خدمت میں ہدیۂ نیاز

خاکسار

مولف

دعا

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریّا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے

احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

گذارش :- ایک مضمون میں اس دعا کا ذکر آیا ہے اس لیے مناسب تھا کہ اسے بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا جائے لیکن ایک مسلمان کے جن جذباتِ صادقہ کا اس نظم میں بہ طور دعا اظہار ہوا تھا اس کے پیشِ نظر اس کی شمولیت آغازِ تالیف میں موزوں نظر آئی (ابو سلمان شاہجہان پوری)

مولانا محمد علی

بہ حیثیت نقاد و ماہر اقبالیات

مولانا محمد علی کو علامہ اقبال کی شاعری سے جو دل چسپی تھی، وہ ان کی سیرت کا ایک معلوم واقعہ ہے۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ یہ مثنویاں ان کی قید کی تنہائیوں اور سفر و حضر کی رفیق تھیں۔ ان کے اشعار کو وہ بہت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اپنے لکچروں اور تقریروں میں انھیں استعمال کرتے تھے اور اپنے افکار و خیالات پر ان سے استدلال کرتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اردو خطوط و مضامین میں بلکہ انگریزی مضامین اور کامریڈ کے اداریوں میں علامہ کے اشعار کو نہ صرف استعمال کیا بلکہ ان پر تبصرہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے بارے میں عمومی اظہار خیال بھی۔ لیکن اقبال کی شخصیت اور شاعری پر سب سے زیادہ مفصل تحریر، ان کے وہ پانچ مضامین ہیں جو ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں شائع ہوئے۔ اگرچہ یہ مضامین علامہ مرحوم کی شاعری پر اصولاً نقد و تبصرہ نہ تھے بلکہ علامہ کے بعض سیاسی خیالات پر بحث و نظر کے ضمن میں ان کی فکر اور شاعری کا ذکر آگیا تھا اور اس سلسلے میں اس پر بھی ایک ناقدانہ نظر ڈال لی تھی۔ لیکن ان مضامین میں جس قدر اور جس طرح بھی اس کے محاسن و معائب کا ذکر آیا، وہ ایسا نہیں کہ اسے محمد علی کی ادیبانہ و نقادانہ حیثیت کی تلاش میں نظر انداز کر دیا جائے۔

اس مضمون میں محمد علی کے مذکورۂ بالا سلسلۂ مضمون کی روشنی میں ان کی ادبی حیثیت کے حوالے سے بعض خصائص کی جستجو کی گئی ہے۔

محمد علی کی نظر اقبال کی شاعری کے ہر دور پر اور اس کی خصوصیات پر ہے۔ انھوں نے

اقبال کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے :

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک محدود تھا اور "ترانہ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "نیا شوالہ" سب اسی دور کی نظمیں ہیں۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دوسرا دور چلا ——— اور

۱۹۰۸ء سے وہ آخری دور چلنا شروع ہوا، جو بہ ظاہر اب تک چل رہا ہے۔

اس آخری دور کا آغاز "بلاد اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے، جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے۔

مثلاً انھوں نے اس نظم کے متعدد اشعار پیش کر دیے ہیں۔ اس دور کے بارے میں مولانا کا خیال ہے :

"اقبال اب حقیقت کی طرف جلد جلد ترقی کر رہے تھے۔ اس کے بعد گورستان شاہی پر جو نظم لکھی گئی۔ اس میں البتہ چند شعر ایسے ہیں کہ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اب بھی بعض اوقات چیزوں پر ایک سطحی نظر ڈال رہا ہے۔"

اور اس بات کے ثبوت میں انھوں نے اقبال کا یہ شعر پیش کیا ہے :

ہے تو گورستاں مگر بہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ یک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

پھر اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں :

"اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ اقبال بھی ان تاریخوں کے مولفوں کی طرح، جو اسکول کی خواندگی میں داخل کی جاتی ہیں، اقوام کو بادشاہوں سے تمیز نہیں کر سکے۔"

اس کے بعد اس نظم کے متعدد اشعار پر تنقید و تبصرہ کی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ ایک شعر ان کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں :

"افسوس ہے کہ اقبال بھی نفس پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے

کو "عہد رفتہ" سمجھے اور انھوں نے فرمایا کہ :

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھولنے والی نہیں"

اس پر طنزیہ الفاظ میں مزید لکھتے ہیں :

"ہاں اس امّت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے۔ انھیں نے حضرت معاویہؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحید الدین کے زمانے تک اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کو امّت محمدیہ اور ملّتِ اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی اور ہم کو تباہ و برباد کر دیا۔"

مولانا محمد علی کے بقول "اقبال اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے مگر بحمد اللہ جنگ عمومی تک اس پر آ پڑے اور خدا مزدوران کو حقیقتوں کو آشکار کرنے کی جزائے خیر دے گا۔" مولانا کے نزدیک "گورستانِ شاہی" لکھتے وقت اقبال پوری طرح صحیح راستے پر نہ تھے اور حقیقت کا پورا پورا انکشاف اس وقت ان پر نہ ہوا تھا، لیکن "رموزِ بے خودی" میں وہ صحیح راستے پر آ پڑے تھے۔ گورستانِ شاہی پر بہ حیثیت مجموعی سخت تنقید کے باوجود انھوں نے اس کے متعدد اشعار کی تحسین بھی کی ہے اور جی کھول کر داد دی ہے۔ اس نظم کے حوالے سے تیسرے دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں :

"اقبال کی شاعری کا جو تیسرا دور ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے، اس کی ابتدا ان دو نظموں سے ہوئی تھی، لیکن حقیقتہً اس تمام دور کی شاعری کا لبِ لباب ۔۔۔۔ ترانۂ ملّی تھا ۔۔۔ آج کون ہے جس نے یہ ترانہ نہیں سُنا ہے لیکن پھر بھی دل مجبور کر رہا ہے کہ اس کے وہ شعر نقل کر دوں جن میں ملّتِ اسلامیہ کی تفسیرِ حیات اور ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر کا اظہار کیا گیا ہے۔"

۔۔۔ ترانۂ ملّی، کے بعد وطنیّت پر اقبال کی نظم ہے ۔۔۔ اس نظم میں وہی

خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، جن کا 'رموزِ بے خودی' میں اسلام کو تہذیبِ مکانی سے آزاد ظاہر کرنے کے متعلق اظہار کیا گیا ہے۔"

تیسرے دور کی شاعری پر طویل تبصرے کے دوران میں محمد علی نے مختلف نظموں کے بہت سے اشعار اپنے خیالات کی تائید میں پیش کیے ہیں۔ اور چونکہ یہ بحث اقبال کی قوم پرستی کے سلسلے سے چھڑی تھی اس لیے آخر میں وہ اقبال ہی سے یہ سوال کرتے ہیں:

"اقبال، کیا دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ آج ان کی سچی خدا پرستی اور ملّت پروری کی نمائندگی خود ان کی ملّت کی گگڑوں کوں، جو اس کے اخبارات اور اس کی تقریروں میں سنائی دیتی ہے، کر رہی ہے؟"

اور پھر اقبال کو الزام دیتے ہیں کہ جو افکار وہ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں کہ:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ایسا حقیقت میں نہیں چین، عرب، ترکی، حجاز کچھ بھی ہمارا نہیں اور اقبال جس سچی قوم پروری کا حوالہ دیتے ہیں، اس کی مثال تو پنجاب بھی پیش نہیں کر رہا ہے۔ بلاشبہ ایسا ہی تھا لیکن کیا اس کا الزام شاعرِ وطن و شاعرِ اسلام اقبال کو دیا جا سکتا ہے۔ یہ توقع صرف محمد علی ہی کر سکتے تھے۔ اگر اقبال بھی معیاری و مثالی فکر و تصورِ حیات پیش کرنے کے بجائے گرد و پیش کے حالات کو اپنی نظم میں بیان کر دیتے تو پھر وہ 'اقبال' کہاں ہوتے، ان کا کلام بھی "نمونۂ جنگ صفین" ہوتا لیکن مولانا محمد علی شاید پھر بھی خوش نہ ہوتے۔

مولانا محمد علی کی نظر اقبال کی شاعری کے نشیب و فراز اور ارتقا پر بہت گہری تھی۔ گورستانِ شاہی میں اقبال کے بعض اشعار کی انھوں نے نشان دہی کی ہے اقبال نے کہا تھا:

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امّت بھولنے والی نہیں

اس شعر کے بارے میں مولانا محمد علی لکھتے ہیں :

"افسوس ہے کہ اقبال بھی نفسِ پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے کو "عہدِ رفتہ" سمجھے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں :

"ہاں اس امت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے۔ انھیں نے حضرت معاویہؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحید الدین کے زمانے تک اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کو امّت محمدیہ اور ملّت اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی اور ہم کو تباہ و برباد کر دیا۔"

محمد علی کے نزدیک "اقبال اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے۔" جب انھوں نے یہ شعر کہا تھا لیکن جنگ عمومی تک وہ اس صحیح راستے پر ضرور آ پڑے۔ اس کے ثبوت میں یا صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے انھوں نے رموزِ بے خودی سے ۲۷ شعر نقل کر دیے ہیں؛ پھر لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ بادشاہت کی اور کیا مذمت ہو سکتی ہے ؛ لیکن یہ درحقیقت جملہ معترضہ تھا جو تنقید کے بیچ میں آ گیا تھا، اس لیے اس سے گذرتے ہی حرفِ مطلب پھر زبانِ قلم پر آ گیا۔ کس حسرت سے فرماتے ہیں:

"کاش آج بھی اقبال کو کربلا کی فتح نمایاں اسی طرح یاد ہوتی اور ارضِ پاک حجاز میں "یزیدیت" کے مقابلے کے لیے وہ بھی "شبیریت" کا علم لے کر نکلتے اور بہ جائے کونسل کے داخلے کے مؤتمر عالمِ اسلام میں شرکت فرماتے"

میں نے کہا ہے کہ محمد علی کی نظر اقبال کی شاعری کے نشیب و فراز پر اور ارتقا پر بہت گہری تھی، مجھے کہنا چاہیے کہ ان کی نظر اقبال کی ایک ایک نظم اور اس کے ہر ہر شعر پر تھی۔ اسی نظم گورستان شاہی کے تعارضات پر بحث کرتے ہوئے، وہ تعجب کرتے ہیں کہ اقبال بادشاہوں کے اجڑے ہوئے گورستان کو دیکھ کر یہ کس طرح کہہ سکا کہ

آہ مسلم بھی زمانے سے یوں ہی رخصت ہوا
آسمان سے ابر آزاری اٹھا، برسا، گیا

اس کے بعد لکھتے ہیں :

"یقیناً اس وقت تک حقیقت کا پورا انکشاف نہ ہوا تھا۔ مگر یہ ظلم ہوگا کہ میں اس کو بھی ظاہر نہ کر دوں کہ اس نظم کے آخر میں اقبال نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ؎

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امّید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور — ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور"

آخری شعر میں علامہ اقبال نے جس خیال کا اظہار کیا ہے، مولانا نے اگرچہ مذکورہ بالا تینوں اشعار کو مثالاً اور استدلالاً پیش کیا تھا اور اصول راست گوئی کے تحت ان پر تنقید مناسب نہ تھی، لیکن محمد علی اپنی تحریر اور تنقید میں کسی اصول پر کاربند اور ضابطے کے پابند ہیں کب جس کی ان سے توقع کی جائے۔ چناں چہ آگے بڑھتے بڑھتے پیچھے پلٹ کر پھر ایک اعتراض جڑ دیا۔ مذکورۃ الصدر اشعار میں آخری شعر پر پھر ایک نظر ڈال لیں اور پھر محمد علی کے ان جملوں سے لطف اندوز ہوں :

"تاہم میرے نزدیک جو کچھ اسلامی بادشاہوں نے دکھایا، وہ اکثر اسلام کی شانِ جلالی کا بھی ظہور نہ تھا۔ وہ شانِ جلالی جو ہر زبردست، زیردست کو دکھا سکتا ہے، اسلام کی شانِ جلالی نہیں۔ اسلام کی شانِ جلالی کو تو صرف وہی دکھا سکتا ہے، جو اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکے اور جو ابھی اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکتا ہے، وہ یقیناً اسلام کی شانِ جلالی بھی دنیا کو ایک بار پھر دکھا دے گا۔"

مولانا محمد علی نے اقبال کی بعض نظموں کو اپنی پسند کے مطابق بعض نظموں پر ترجیح دی ہے۔ مثلاً "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ان کے نزدیک "ترانہ ہندی" سے "صحیح تر" خیالات کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن وہ چوں کہ حالات اور گرد و پیش سے الگ کر کے کسی فکر کو نہیں دیکھ سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اس قومی گیت کے اس شعر کو "مشتبہ شعر" بھی قرار دے دیا ہے۔

جنّت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ظاہر ہے ۱۹۲۲ء کے بعد ۱۹۲۷ء تک کا جو زمانہ گزرا تھا اور شدھی سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے جو ہنگامے برپا ہوئے تھے انھیں مولانا محمد علی پسند نہیں کرتے تھے اور ملک کی اس عہد کی زندگی کو امن و سکون اور اطمینان و خوشی کی جنت کی سی زندگی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مولانا کی نظر میں اقبال کا یہ شعر "مشتبہ" ٹھیرا۔

"نیا شوالہ" کو ان دونوں نظموں کے مقابلے میں "بے مثل نظم" اور اس کے شاعر کو "سچی قوم پروری کا ترجمان اور نمایندہ" قرار دیا ہے، لیکن اس مضمون کے آخر میں انھوں نے اپنے خاص اندازِ فکر اور ذوق کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں بھی ایک اونچے تیرتھ کی تلاش میں احرام سفر باندھ چکا ہوں اور یقیناً دنیا کے تیرتھوں سے میرا تیرتھ بھی اونچا ہے۔ اس کا کلس دامانِ آسمان سے ملا ہوا نہیں ہے، بلکہ اونچے سے اونچے آسمان سے بھی زیادہ بلندی پر وہ عرش و کرسی بچھی ہوئی ہے، جس پر میرے دیوتا کی وہ مورتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکے، نہ چھو سکے اور پھر بھی خود میری شہ رگ سے وہ قریب تر ہے۔"

لیکن اگر محمد علی یہیں پر قلم روک لیتے تو محمد علی کیوں کہلاتے، ایک ضابط و ناظم مدبر اور نقاد نہ کہلاتے! محمد علی کی خاص پہچان ان کے یہ جملے ہیں، جو اوپر کی عبارت سے رشتۂ ربط و انسلاک رکھتے ہیں:

"لیکن اس کا تو مجھے کبھی بھی شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اقبال کا اونچا تیر تھہ فقط شملے کی بلندی تک اونچا ہے۔"

اگرچہ اس اظہار خیال کا یہاں کوئی موقع نہ تھا لیکن اس پیراگراف میں بہ طور ٹیپ کے بند کے، یہی جملہ ہے اور شاید اسی ایک جملے کے لیے اس پورے پیراگراف کی تحریر و تزئین کا یہ اہتمام کیا گیا تھا۔

محمد علی کے قلب پر اس بات کا بڑا اثر ہے کہ اقبال کا عمل ان کے عقیدے۔ یعنی ان کی اپنی شاعرانہ فکر کے مطابق نہیں۔ وہ اقبال کو ایمان اور عمل صالح کا پیکر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں ایمان اور عمل صالح کے الفاظ اسلامیات کی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیے بلکہ شاعرانہ فکر اور اس کا پیکر، کے معنی میں استعمال کیے ہیں؛ محمد علی جب اپنی اس آرزو کو پورا ہوتا ہوا نہیں دیکھتے تو نہ صرف بے چین، بلکہ غضب ناک ہو جاتے ہیں اور پھر طنز و تعریض ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ مثالوں سے ان کے فکر صالح و صحیح اور اس کے برعکس عمل کو بھی واضح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ان کے سیکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے، جب کہ کبھی بیجاپور کے جیل خانے میں زبان پر بھی آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا جو کسی ایسے خاندان والوں کے قلب پر ہوتا جن کی ایک چہیتی لڑکی کسی شرم ناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلا دینے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی نظر اس پر پڑ جائے۔ محبت اور شرم دونوں کی کشمکش، اس سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کون سی جنگ ہو سکتی ہے۔"

یہ مثال اپنی جگہ پر خواہ کتنی ہی موثر ہو، لیکن اس کا ادب سے، ادبی اسلوب سے اور ادبی تنقید سے کوئی تعلق نہیں۔ ہماری مجلسی تہذیب بھی اس قسم کی مثالوں کو

زبان پر لانے کی اجازت نہیں دیتی ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت علامہ مرحوم سے عمل کی توقع بھی درست تھی؟ لیکن اس سوال کے صحیح جواب ہم پا نہیں سکتے جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ حضرت علامہ کی شخصیت کا اصل دایرہ کیا ہے؟ پھر اس دایرے میں ہمیں ان کی عظمت کا سر و سامان تلاش کرنا چاہیے ۔

اس مسئلے پر کسی خاص تحقیق و خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں، کسی تمہید کے بغیر ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ علامہ مرحوم اپنے دایرۂ فکر و عمل کی بنا پر ایک شاعر اور فلسفی تھے۔ ہمیں یہیں ان کی عظمت کا نقش تلاش کرنا چاہیے۔ جب ہم یہ اعتراف کرتے ہیں تو میدان عمل میں ان سے رہنمائی کی توقع خارج از بحث ہو جاتی ہے ۔ علامہ اقبال فکر و فلسفہ کی ایک شخصیت تھے جس کا عظیم الشان اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کی عظمت کا دار و مدار ان کی شاعری اور فکر پر ہے، عمل پر نہیں۔ اس لیے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے فکر و فلسفہ کے اس آئینے میں اقبال کی سیرت اور شخصیت کو تلاش کرنا اور اس کے برخلاف پانا تو اسے رد کر دینا اور "اقبال مرحوم" کی پھبتی کسنا اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ شخصیت پر بحث کرتے ہوئے کلام کو اس کے مطابق نہ پاکر اعلان کر دینا کہ فکر غلط اور فلسفہ جھوٹا ہے۔ شاعرانہ فکر اور عملی شخصیت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں کو الگ الگ ہی رکھا جائے۔ علامہ اقبال کی شخصیت میں ہمیں ایک دینی شخصیت کے روز و شب کے مشاغل و معمولات اور ذوق و انہماکِ علم و عمل کو تلاش نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا محمد علی نے اس تنقید میں ذاتی خواہشوں اور آرزوؤں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا قید سے رہا ہوئے تھے تو علامہ کے تہنیتی قطعے سے انھیں بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ قطعہ ان کے لیے کوئی خاص نہ تھا۔ اس کا مضمون و تخاطب عام تھا۔ اسٹیج پر مولانا کی موجودگی نے ان کے لیے ایک امتیاز پیدا کر دیا تھا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں قید سے رہا ہوئے تو پھر ان کا جی چاہا کہ اقبال ان کی پذیرائی فرمائیں مولانا کو شاید اس سے صدمہ ہوا۔ چناں چہ فرماتے ہیں :

"اس بار جو ہم جیل خانے سے چھوٹے تو "اقبال مرحوم" ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے، اس کے بعد کس نظم کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی اور ان کے لیے سوائے دامِ اقبالہم کے کس چیز کی دعا کی جا سکتی تھی۔ بہ قول انھیں کے، اب تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ ؎

اعتبارِ ملتِ بیضا شکست　　واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست

مفتی دینِ متیں فتوی فروخت　　واعظ ما چشم بر بت خانہ دوخت

رخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما　　چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما

یہ محمد علی کے دل کی خوبی ہے کہ اقبال کے نظم نہ کہنے کی صرف ایک وجہ معلوم ہوئی کہ اب وہ سر کے خطاب سے سرفراز ہو چکے تھے۔ محمد علی کے نزدیک اس تحریک کے بارے میں جس کے نتیجے میں وہ جیل گئے تھے، اقبال کی رائے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اقبال کی قوم پروری کا صرف یہی ایک ثبوت ہو سکتا تھا کہ وہ محمد علی کی خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق اپنے افکار و خیالات کا رخ بدلتے رہیں۔

محمد علی نے اقبال کے اشعار کی روشنی میں وقت کے حالات پر بھی نظر ڈالی ہے:

"آج جب کہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا ہے، یہ کہنا قطعاً جھوٹ ہے کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور یہ تو اس سے بھی زیادہ جھوٹ ہے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

لیکن کیا یہ اُس سے زیادہ صحیح ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

چین انگریزوں کا امریکنوں کا ہے یا جاپانیوں کا ہے یا شاید روسیوں کا ہو جائے یا (خدا کرے) پھر چینیوں کا ہو جائے، جن میں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصا عنصر ہے۔ لیکن یقیناً ہمارا تو آج ہرگز نہیں ہے اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں کا یا یہودیوں کا یا جدیوں کا اور یمنیوں کا۔"

اب اگر وقت کے حالات علامہ کے فکر کے سانچے میں نہ ڈھل سکیں تو اسے علامہ کا جھوٹ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاعر ایک آئیڈیل زندگی اور مثالی معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے، وہ اسی معاشرے اور زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے، حالات اس کے برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔ اقبال شعر کہہ رہے تھے نہ کہ تاریخ لکھ رہے تھے۔ انھیں دنیا کا کوئی قانون اور شاعری کا کوئی فلسفہ آئیڈیل کو ترک کر دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن مولانا محمد علی ان سے یہی توقع رکھتے تھے۔

علامہ اقبال کے خلاف انھوں نے جس جوش، شدت جذبات اور انتہا کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ان کی سیرت کا کوئی مستثنیٰ واقعہ نہیں۔ انھوں نے اس عہد کے ہر شریف آدمی، خواہ ہندو ہو، خواہ مسلمان، کے خلاف اخلاق کی اسی شدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نواب رام پور کے خلاف انھوں نے بعض مصالح کی بنا پر واقعی کچھ نہیں لکھا یا ممکن ہے یہ بھی میرے دست تحقیق کی کوتاہی اور نظر جستجو کی کمزوری ہو لیکن ان کا اپنے محسن راجہ صاحب محمود آباد کے خلاف ایک سخت خط موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس عنصر میں حق بہ جانب بھی ہیں۔ راجہ صاحب ہی کے کہنے پر اور ان کی منت سے مجبور ہو کر یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں انھوں نے

اپنے حریت پسند ساتھیوں مولانا حسرت، مولانا آزاد وغیرہ کو چھوڑ کر اور خود اپنی ذاتی رائے کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ جب ان پر یہ انکشاف ہو کہ وہ سب کچھ محض فریب تھا تو ان کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔ یہ خط انھوں نے چھنڈواڑا میں نظر بندی کے زمانے میں لکھا تھا اور الناظر لکھنو میں ایڈیٹر کے تبصرے کے ساتھ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا۔

محمد علی نے اپنے دیگر محسنوں میں حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، بزرگوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ، دوستوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، غلام بھیک نیرنگ، ڈاکٹر محمد عالم، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی خواجہ حسن نظامی اور رفقت کے بیسیوں ہندو اور مسلمان زعما کے خلاف زہر چکانی کی ہے اور انھیں مختلف القابات سے نوازا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یہ محمد علی پر صادق آتا ہے۔

اس لیے انھوں نے اقبال کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے اقبال کے نیاز مندوں کو رنجیدہ نہ ہونا چاہیے۔

بعض دوست ان کی زود رنجی اور اشتعال انگیزی کو ان کی کمال درجہ اسلامیت، دینی غیرت اور ملی حمیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر ان کی فکر اور سیرت کی یہ واقعی خوبی ہے تو پھر آیئے اسی خوبی کو معیار بنا کر بہ شمول اقبال و قائد ہر اس شخص کے بارے میں ان کا فیصلہ تسلیم کر لیں جس پر انھوں نے اپنے قلم و زبان کے تیر اور برچھیاں چلائی ہیں۔

اقبال پر محمد علی کی تنقید صحافیانہ ہے یا سیاسی۔ اس تنقید میں ہم ان کی باریک بینی، نکتہ رسی، گہری نظر اور معانی آفرینی کی خواہ کتنی ہی داد دیں، اس کی بنیاد پر ہم انھیں ادبی نقاد نہیں کہہ سکتے۔ ان کا مقصد بھی ان کے کلام کے خصائص کی تلاش و

تفہیم، نہ تھا بلکہ ان کے سامنے ایک سیاسی مقصد تھا اور ان کے کلام کی تشریح کی غایت بھی اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ دیکھو فلاں موقع پر تم نے یہ کہا تھا، فلاں نظم میں تم نے اس خیال کا اظہار کیا تھا اور اس کے برعکس تمہارا اپنا عمل یہ ہے۔ انھوں نے کلام کو شاعر کی سیاسی شخصیت اور اس کے سیاسی افکار کے رد کے لیے استعمال کیا ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے اقبال کے اشعار کی تعریف بھی کی ہے لیکن یہ تعریف محض تحسین ہے نہ کہ تنقید۔ یہ تحسین ان کے بعض خطوط میں ملتی ہے۔ اور بعض دیگر مضامین میں انھوں نے اپنے خیالات کی صحت پر استدلال کے لیے یا رنگینیٔ بیان میں اضافے کے لیے شعرِ اقبال سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی تنقید کے دایرے میں نہیں آتی۔ تنقید کے دایرے میں ان کا صرف یہی سلسلہ مضمون آتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے تنقید کی کس قسم سے معنون کیا جائے، میرے نزدیک ان کی تنقید ادبی تنقید کہلانے کی مستحق قرار نہیں دی جا سکتی۔ ادبی تنقید کا مقصد خصائص کی تلاش و تفہیم اور اس سے لطف اندوزی، حصولِ مسرت اور قارئین کو اس تلاش و تفہیم اور لطف و مسرت میں شریک کر لینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے خاص زبان اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی مقاصد، صحافیانہ انداز اور جارحانہ اسلوب جو محمد علی کے اس سلسلۂ مضمون کی سب سے بڑی خوبی ہے، وہ اسے ادبی تنقید کے دایرے سے نکال کر بہت دور لے جاتی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ محمد علی کی زبان اکثر مقامات پر ادبی معیار پر پوری نہیں اترتی اور تنقید کا کوئی عمدہ اور قابلِ تقلید نمونہ پیش نہیں کر سکی۔ بلاشبہ جو عقیدت و احترام اور جذبات نیازمندانہ خردوں کے قلب میں ہوتے ہیں۔ انھیں برابر والوں، ہم نشینوں اور ہم عصروں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے سے خانے کی چھت کا معاملہ یقیناً اس سے مختلف ہوتا ہے جو عام زندگی میں دو اشخاص کے مابین مجلسی و تہذیبی اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن برابری اور ہم نشینی

کا یہ تقاضا تو نہیں ہو سکتا کہ ایسے خیالات کو جن سے اتفاق نہ ہو "بکواس" قرار دیا جائے:

"ہمیں اسی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ خدا نے جس شخص کو "شمع و شاعر" اور "اسرار و رموز" کے لکھنے کی عجیب قدرت عطا فرمائی تھی وہ کہاں چودھری شہاب الدین کی زیر صدارت پنجاب کونسل میں "بکواس" کرنے جا رہا ہے۔"

یا وہ لکھتے ہیں:

"میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا انہیں نے ہمیں نہیں سکھایا تھا کہ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

لیکن آج وہ ایمان ابراہیمی کا نسخہ ہمارے لیے تجویز نہیں کرتے بلکہ خود نمرود کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہم کو بھی حکم دیتے ہیں کہ اسی کو سجدہ کرو، گو وہ سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نہیں نکال سکتا۔"

اسی طرح ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"ان شاء اللہ کل ان کی تقریر کے وہ جملے ۔۔۔۔۔ اور پھر کچھ "شمع و شاعر" کے منظوم مکالمے میں سے بھی نذرِ قارئین کیا جائے گا جس کو اسی آج کے انگریز پرست نہ سہی انگریز پرور شاعر نے اپنے پچھلے جنم میں تصنیف کیا تھا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"اس کا تو مجھے بھی شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اقبال کا اونچا تیر نقطہ فقط شملہ کی بلندی تک اونچا ہے۔"

یہ اور اسی قسم کے جملے ادبی تنقید میں شمار نہیں ہوتے۔

اگرچہ محبوب محب کی تنقید و تعریض کا ہمیشہ نشانہ رہا ہے، لیکن یہ تنقید خاص الفاظ و اصطلاحات اور خاص اسلوب کے ساتھ ملزوم رہی ہے۔ یہ رشتہ خاص

تہذیب اور اسلوب بیان کا متقاضی ہے۔ اقبال محمد علی کے محبوب تھے، شاعر اسلام تھے، اسلام کا سبق انھوں نے کسی مولوی کے بجائے اقبال سے لیا تھا پس ایسے مقدس اور محترم رشتے کے باوجود ان کے خیالات کو "بکواس" کہنا، داعیہ و آداب عشق کے منافی ہے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق (محمد علی) طنز و تعریض سے محبوب کو اپنی طرف مائل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس سے انتقام لے رہا ہے۔ اگر محمد علی اقبال کی شاگردی سے انکار بھی کر دیں تو یہ انداز بیان اخلاق و تہذیب کے عام اصول کے خلاف قرار پائے گا، ان کی صحت دماغی پر شبہ کیا جائے گا اور کچھ نہیں تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

مولانا محمد علی کی جو ادبی اور تنقیدی تحریر ہمارے پیش نظر ہے، اس کا مطالعہ ہمیں ان کے جن اصولِ نقد کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ یہ ہیں :

(۱) فکر کی صحت

(۲) سیرت و عمل کی صداقت

(۳) تاریخ کی شہادت

(۴) اسلامی تعلیمات کی تعبیرات اور ان کے اطلاقات

ان کی فکر کا تعلق ادب و تنقید کے کسی اسکول یا فلسفے سے نہیں ہے ان کی فکر کا دارو مدار مطلقاً اسلامی تعلیمات اور ان کی رہنمائی اور تاریخ کی شہادت پر ہے۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کسی شخص (مسلمان) کے تمام افکار و عقائد اور خیالات و نظریات کی صحت اور سیرت و عمل کی صداقت کے لیے کسوٹی اور معیار ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعرانہ فکر اور فلسفۂ سیاست کی صحت کو جانچنے کے لیے بھی اسی کسوٹی سے کام لیا ہے۔

بلاشبہ ایک مسلمان کے فکر و فلسفہ اور عقیدہ و عمل کی جانچ کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام کی کن تعبیرات، کس نظام فکر اور

کس فلسفے اور عقیدے کے مطابق یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اقبال کا نظام فکر اور ان کا فلسفۂ سیاست درست تھا یا نہیں ؟ مجھے یقین ہے کہ اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اقبال کی فکر، رائے اور سیرت و اعمال کے فیصلے کے لیے خود اقبال کے نظام فکر اور ان کے اپنے فلسفۂ سیاست کو سامنے رکھنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح کہ محمد علی کی سیرت کی عظمت کے فیصلے کے لیے ان کے اپنے عقائد اور فلسفۂ سیاست کو رکھنا ضروری ہے۔ اقبال کی فکر اور سیرت کی عظمت کا فیصلہ محمد علی کے عقیدے اور فلسفہ و اصول سیاست کی کسوٹی پر کیا جائے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مولانا محمد علی دنیا سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ اس اصول و بنیاد پر نہ صرف اقبال کہ مسلمان فلسفی اور اسلامی فکر کے ترجمان شاعر تھے بلکہ مالویہ جی اور جواہر لال کی سیرت اور شرافت کا فیصلہ بھی کر دیا جائے کہ ان کے (محمد علی کے) نزدیک کیا صحیح اور کیا غلط تھا۔ محمد علی کا جذبہ خواہ کتنا ہی قابل تعریف اور ان کا دل خواہ کتنا ہی نیک اور صاف ہو لیکن تنقید کے لیے کسی خارجی نظریہ و فلسفہ کو صداقت کا معیار قرار دینا قرین انصاف نہیں۔ کسی شخص کی سیرت کی بلندی و پستی کے فیصلے کے لیے اس کے اپنے اصول اور فلسفۂ حیات کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ برٹش استعمار کے خلاف جہاد، بغاوت، مصائب و ابتلا میں صبر و استقامت اور حصول آزادی کی جد و جہد میں ایثار و قربانی کی داد ان حضرات سے کیا مل سکتی ہے جو ہندوستان کو دار الاسلام اور انگریز حکام کو مسلمان اصحابِ امر (اولی الامر منکم) میں شمار کرتے ہوں۔

مولانا محمد علی کی تحریر کی ایک خوبی، آپ چاہیں تو اسے خامی قرار دے لیں، یہ ہے کہ وہ بحث کرتے ہوئے اطراف و جوانب میں بہت دور تک نکل جاتے ہیں جس طرح ان کی زبان جذبات سے متاثر ہو کر ہمیشہ بے قابو رہی، اسی طرح ان کا قلم بھی ہمیشہ جذبات کے ہاتھ میں رہا جس زمانے میں خواجہ حسن نظامی کی جاسوسی کے سلسلے میں ہمدرد میں بحث چل رہی تھی، خواجہ صاحب نے کہیں یہ لکھ دیا کہ محمد علی اپنے

معاصرین کی شہرت اور مقبولیت سے جلتے ہیں اور حسد و رقابت کے مرض میں مبتلا ہیں۔
خواجہ صاحب کا مقصد شاید یہ ہو کہ مولانا اصل موضوع سے ہٹ جائیں۔ خواجہ صاحب
اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ خواجہ صاحب کے اس جملے نے مولانا
پر ایسا اثر کیا کہ مولانا نے اپنی صفائی میں ایک نیا سلسلہ مضمون شروع کر دیا اس میں
رقابت کی تعریف، رقابت اور نفسیات کا تعلق اور پھر حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد
انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں سے اپنی رقابت یا اپنے خیال کے مطابق
ان حضرات سے اپنے اصولی اختلاف کا اظہار واقعی کیا اور رقابت کے الزام سے پرزور صفائی
پیش کی۔ ان کا یہ سلسلۂ مضمون ہمدرد کی ۱۳، ۱۵، ۱۶ اور ۲۱ دسمبر ۱۹۲۶ء کی چار اشاعتوں میں
نکلا۔ اور اگرچہ انھوں نے اپنی صفائی میں ایک نیا علم کلام مرتب کر دینے کی پوری کوشش کی،
لیکن زیادہ آسانی کے ساتھ اس سے ان کی رقابت اور دل کا کھوٹ ہی ثابت کیا جا
سکتا ہے۔

محمد علی کے لامحدود بحث و کلام کی جس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خوبی اس
سلسلۂ مضامین میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو اقبالیات کے ضمن میں پیش نظر ہے۔ بحث
تھی ملت پروری پر علامہ اقبال کے طنز کی، لیکن محمد علی ایک طرف تو اقبال کی فکر، شاعری
اور ان کی سیرت کی بحث میں اصل مبحث سے بہت دور چلے گئے، نیز یہ کہ خواجہ حسن نظامی
کو اس بحث میں گھسیٹ لیا۔ آگے بڑھے تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا
محمد اسماعیل غزنوی "اقبال صاحب کے پنجابی" بھائی سامنے آ گئے، ان سے بھی صرف نظر
نہیں کر سکتے تھے۔ گویا کہ لدھیانوی و غزنوی کے اعمال کے ذمے دار بھی حضرت علامہ ہی
تھے۔ محمد علی کا ان حضرات کو اس بحث میں گھسیٹ لانا اور حضرت علامہ پر اس کا غصہ
اتارنا، ذرا بھی غور کریں تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء تا فروری
۱۹۲۷ء جب محمد علی اور حسن نظامی میں معرکۂ کارزار گرم ہوا تو انھوں نے اپنے تمام
معاصر سے اس توقع کا اظہار کیا کہ خواجہ صاحب سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔
لیکن ان کے اس مطالبے پر توجہ نہیں دی گئی۔ علامہ مرحوم نے بھی خواجہ صاحب سے

تعلقات کے انقطاع کو رواداری کے خلاف سمجھا۔ اقبال مرحوم اور دوسرے معاصر کا موقف یہ تھا کہ خواجہ صاحب سے کسی بات کا ظہور اچانک تو نہ ہو گیا تھا، جاننے والے ان کے مزاج و سیرت سے خوب واقف تھے۔ ان کی سیرت عام پیروں اور سجادہ نشینوں سے مختلف نہ تھی اور یہ طبقہ نوابوں اور جاگیرداروں کے بعد برٹش استعمار کا سب سے بڑا پشتیبان تھا۔ اگر اس علم کے باوجود برس ہا برس سے ان سے اور ان جیسے دوسروں سے تعلقات تھے، رواداری برتی جا رہی تھی، وضع داری قائم تھی اور سلیقے سے نبھ رہی تھی تو اب ایسا کون سا انکشاف ہو گیا تھا کہ ان سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ چناں چہ بعض معاصرین اس بحث سے الگ تھلگ رہے، بعض نے دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کی اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ محمد علی نے بھی انھیں نہ صرف معاف کر دیا، بلکہ خواجہ صاحب کے خسر مفتی محبوب علی کے قتل پر ان کا مضمون ہمدرد میں چھاپا اور ان کے گھر تعزیت کے لیے گئے اور سب کچھ رفت گذشت ہو گیا۔ جب لوگ جانتے ہوں کہ محمد علی کے فیصلے کو ثبات نہیں تو وہ اپنی وضع کیوں بدلیں۔ لیکن محمد علی اور خواجہ حسن نظامی میں میل ہو جانے کے باوجود دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہ تھے۔ خواجہ صاحب نے ایک معرکے کی یک طرفہ روداد "نمونۂ جنگ صفین" کے نام سے چھاپ دی اور اس طرح نہ صرف مستقل انتقام لیا بلکہ اپنے نقصان کی تلافی کی سبیل بھی نکال لی۔ محمد علی نے اس مضمون میں اور دیگر مضمونوں میں خواجہ صاحب پر حملے جاری رکھے۔

مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن سے تعلقات مسئلہ خلافت میں اختلاف اور مسئلہ حجاز کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے۔ خصوصاً حجاز کے لیے وفد خلافت کی واپسی کے بعد اس کے ارکان میں اختلاف نے محمد علی کو سیخ پا کر دیا تھا۔ یہ وفد ۱۹۲۵ء کے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں محمد شعیب، مولانا محمد عرفان اور مولانا ظفر علی خاں پر مشتمل حجاز کے حالات کے مطالعے کے لیے گیا تھا۔ وفد کے ارکان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ شعیب و عرفان نے

ظفر علی خاں کی رائے سے اختلاف کیا۔ سید صاحب کا رجحان آخرالذکر کی طرف تھا۔ رپورٹ عرفان صاحب نے مرتب۔ ظفر علی خاں نے اپنی تحریر کردہ روداد کو بہ طور ضمیمہ شامل کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا محمد علی نے سیّد سلیمان ندوی پر بھی طنز کیا اور ظفر علی خاں کے مخالف بھی ہو گئے۔ پنجاب کے اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد اسماعیل غزنوی کے وہ پہلے ہی مخالف تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مسئلہ حجاز میں ان ہی علمائے کرام کے ہم رائے تھے محمد علی نے اس مضمون میں غزنوی و لدھیانوی پر اسی پس منظر میں ناوک افگنی کی ہے اور اس کا طعنہ اقبال کو "ان کے پنجابی بھائی" کہہ کر دیا ہے۔ اس سلسلۂ مضمون میں ان کا موضوع، معلوم ہے کہ حضرت علامہ اقبال کی سیاست تھا، ان کی عام سیرت اور شاعری نہ تھا لیکن ان مباحث کو انھوں نے اس طرح گڈ مڈ کر دیا ہے کہ الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کی سیاست کچھ بھی تھی، یہ بھی تسلیم کہ محمد علی کو اس سے نہ صرف اختلاف کا حق تھا۔ بلکہ ان کا اختلاف درست بھی تھا لیکن علامہ مرحوم کی شاعری، ان کے اسلامی و ملی افکار اور ان کی عمومی شخصیت اور سیرت اس سے بالکل الگ چیز تھی اور ضروری تھا کہ اسے سیاسی بحث و اختلاف سے الگ رکھا جاتا۔ لیکن محمد علی سے عالمِ جوش جذبات میں دائرہ و درجۂ اختلاف کی پابندی کی توقع عبث ہے۔

پھر یہی نہیں کہ جوش جذبات میں وہ علامہ اقبال کی سیرت و شاعری کے ان گوشوں کی طرف نکل گئے جو ان کے دائرہ بحث میں نہیں آتے تھے بلکہ انھوں نے اس عہد کی کئی اور شخصیتوں کو بھی بحث کی لپیٹ میں لے لیا۔ چوتھے مضمون کے آخر میں جھوٹی قوم پرستی کے ضمن میں انھیں چند اور مثالیں بھی مناسب معلوم ہوئیں۔ پہلے انھوں نے خواجہ حسن نظامی کا ذکر چھیڑ دیا۔ آگے بڑھے تو مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا محمد اسماعیل غزنوی نظر آئے، ان پر لے دے کی، ان کے تذکرے نے حکومت سعودی کی یاد تازہ کر دی اور برٹش استعمار کا وہ تمام پروپاگنڈا ان کے ذہن

میں تازہ ہو گیا جو سعودی حکومت کے خلاف اور باغی شریف مکہ کے حق میں ایک طبقہ کے خیال نے برپا کر رکھا تھا۔ ان خیالات کے ساتھ مولد النبی سلعم کی یاد لازمی تھی، اس یاد کے ساتھ وفدِ خلافت میں اپنی شرکت اور اپنی بہن اور بیوی کو ساتھ لے جانے کی یاد تازہ ہو گئی اور پھر انھیں وہ اندوہ ناک واقعہ یاد آگیا کہ ایک شخص پاجامہ کھول کر ان کے سامنے پیشاب کرنے بیٹھ گیا تھا۔ شاید اسے پاجامہ کھولے بغیر پیشاب کرنا چاہیے تھا اور پیشاب کی جگہ کے انتخاب کے لیے اسے طائف یا یمن کا رخ کرنا ضروری تھا۔

یہ تمام غیر متعلق باتیں جو اس سلسلۂ مضمون میں در آئی ہیں، ان کا تعلق محمد علی کی تحریر کے خصائص سے ہے۔ یہ باتیں قاری کو اصل مسئلے اور واقعی بحث سے دور ضرور لے جاتی ہیں لیکن ان سے تحریر میں دل کشی کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی کی تحریر اقبالیات کے باب ہی میں، ایک عمدہ نمونہ تحریر نہیں، بلکہ اس کے محاسن کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے جو اس وقت ہمارا موضوع ہے۔ اس میں جہاں بہت سے ذیلی و ضمنی مباحث پر روشنی پڑتی ہے، اس سے محمد علی کے اصول جنگ کی تالیف کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ملک کے سیاسی مسئلے کے حل اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کو سمجھنے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں ایک خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے۔ سب دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم "الدّ الخصام" سمجھتے ہو، جو ان اصولوں سے جن پر اسلام مبنی ہے، کبھی تمہارے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے اور ان اصولوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہیں، جو تمھیں سب سے زیادہ خائف

کیے، ہوئے ہیں اور اگر ہو سکے تو ان کے خلاف اوروں کو اپنا اسی طرح حلیف بنانا جس طرح کہ رسول اکرمؐ نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکینِ مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا۔ گو بعد کو انھوں نے دغا کی اور اس کی خوب ہی سزا پائی، اور بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ، سب کے سب کو یا تو دیس نکالا ملا یا قتل کر دیے گئے۔ اگر کوئی جماعت بھی تمھارے سیاسی تدبّر سے رام ہو کر تمھاری حلیف نہ بن سکے، تب بھی ہر محاذ پر یک ساں زور نہ لگاؤ۔ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور اس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے، پورا زور لگا دو اور جگہ صبر و ضبط سے کام لو۔ جب سب سے بڑے محاذ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے، ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا۔ یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اس کو "عزم امور" کہتے ہیں۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ہ ترجمہ: (اگر تم صبر کرو گے اور خدا ہی سے ڈرو گے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔)"

اگرچہ یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا لیکن اس کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ اس میں مولانا محمد علی کی جنگ سیاسی کے اصول، اس کی ترتیب، اس کا طریق اور استدلال سب کچھ آ گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگا لینا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ ان کے نزدیک غیر مسلم برادرانِ وطن سے اتحاد و اتفاق کا تعلق اسلامی مقاصد سے نہ تھا بلکہ جنگِ سیاسی کی "حکمت عملی" سے تھا، لیکن کیا واقعی انگریزوں سے نمٹ لینے کے بعد مولانا محمد علی ہندوؤں کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہتے تھے یا آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے لیے ان کے ذہن میں کوئی سیاسی منصوبہ اور نقشۂ کار تھا؟ اس موضوع پر بحث کا یہ صحیح مقام نہیں۔ یہاں ہمیں اپنے اظہارات کو علامہ اقبال اور محمد علی کے فکر، استدلال اور طرزِ نگارش کی خوبیوں کی طرف

توجہ دلانا چاہتا تھا۔

لیکن یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے کہ اس اقتباس سے بلا شبہ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ ان کے نزدیک جنگِ سیاسی کی حکمت سے تھا نہ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اسلامی مقاصد سے۔ یہاں محمد علی نے صرف اشارہ کیا ہے لیکن انھوں نے خاص اس مسئلے پر متعدد بار اظہارِ خیال کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کے اسلامی مقاصد اور اجتماعی زندگی کے فروغ کا انحصار ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کے بہترین تعلقات پر تھا۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد جنگ آزادیٔ ملک کی حکمت عملی اور محض ذریعہ نہ تھا بلکہ ہندوستان کی مخصوص زندگی میں اس کی حیثیت ایک عظیم الشان مقصد کی تھی، جسے کبھی مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے تھا۔

بعض خیالات کا اظہار اگرچہ ذیلی وضمنی اور بعض اوقات بالکل غیر متعلق مباحث میں ہوا ہے۔ لیکن اس سے ان کا پورا نظام فکر مرتب کر لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

- اس پر طنز کہ ابن سعود کے خیالات کی اصلاح کی فکر فارن آفس اور انڈیا آفس کو بہت ہے۔
- ابن سعود کے خلاف تنقید وتعریض کا جو طوفان اٹھا، وہ غلط ہے۔
- پڈکوٹہ کے راجہ کے خلاف برا سلوک ہوا۔
- ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ اس عظیم مقصد کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
- شدھی سنگھٹن اور تبلیغ وتنظیم کی تحریکیں غلط تھیں، غلط وقت پر شروع ہوئی تھیں، اس کے منظر کو سمجھنے میں ہندو مسلمان دونوں نے غلطی کی تھی۔ سنگھٹن اور تنظیم کی تحریکیں ہندو مسلم اتحاد کے عظیم مقصد کے مقابلے میں ہیچ تھیں۔ اس ذمہ داری میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے اور دونوں اپنے

دعوے اور عمل میں جھوٹے تھے۔ وہ اس بیان میں نقد کے اعلیٰ اصول کو برتتے اور عدل کے ارفع مقام پر نظر آتے ہیں۔

اگرچہ ان کے اس حصۂ بیان کا تعلق نہ موضوع سے ہے نہ ادبی تنقید سے۔ بلکہ یہ ایک خالص سیاسی تنقید ہے۔ لیکن تاریخ و سیاست کو "ادب" بنا دینے والی زبان اور اسلوب کی بہترین مثال ہے۔ سیاسی ادب میں ان کے یہ جملے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:

"ہماری قوم پروری پر جھوٹے ہونے کا جو الزام انھوں نے لگایا ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر، یقیناً سیاسیین کی ایک بہت بڑی جماعت کی قوم پروری آج جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ہماری قوم پروری سچی ہوتی تو ملابار کے دردناک واقعات کے بعد نہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کو ہندو لیڈر اس طرح جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر شروع کرتے، نہ مسلمانوں میں لیڈری کے دعوے دار اس اثر سے فائدہ اٹھا کر، جو اس انتقام نے عام مسلمانوں میں پیدا کیا تھا، تنظیم و تبلیغ کا نام لیتے پھرتے۔ سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہماری قوم پروری کے جھوٹے ہونے کی، وہ کانگرسی ہندو ہیں جو آج مسلمانوں سے کھلم کھلا دشمنی رکھتے ہیں۔ الحمدللہ کہ ایک دو کے علاوہ اور وہ بھی پنجاب ہی میں، خلافت اور کانگریس والے مسلمان بہت سے کانگرسی ہندوؤں کے اس جذبۂ بغض و عناد سے اس طرح متاثر نہیں ہوئے کہ انھوں نے بھی اس جذبے کو اپنے دلوں میں جگہ دی ہو بلکہ وہ صراط مستقیم ہی پر قائم رہے۔ مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہیں ہی کتنے! باقی مسلمانوں سے صبر نہ ہو سکا اور لیڈری کے دعوے داروں نے انھیں اس طرح گمراہ کر دیا کہ ابتدا ان کی طرف سے نہ ہوئی تو بعض اوقات جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر انتہا وہی کر دیا کرتے ہیں۔"

مولانا محمد علی کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شدھی کا

جواب تبلیغ سے اور سنگھٹن کے مقابلے میں تنظیم اصل مسائل کا حل نہ تھا۔ تنظیم ضروری تھی تو مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی و ملی کے لیے ہر حال میں ضروری تھی، پہلے سے ضروری تھی اور اس وقت سے آج تک ضروری ہے اور اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت تو وہ بھی ہر صورت میں ضروری تھی نہ کہ شدھی کے جواب میں۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو جذبات اور جوشِ انتقام پیدا کر دیا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا محمد علی کی بات کی نہ ہندوؤں میں پذیرائی ہوئی نہ مسلمان ان سے متفق ہوئے۔ وہ جن کاموں کو ہمیشہ سے ہونا چاہیے تھا اور ہمیشہ جاری رہنا چاہیے تھا، اس کے لیے جوش و جذبہ دو چار سال ہی میں ختم ہو گیا اور مسلمان ہمیشہ کی طرح پھر غفلت کی نیند سو گئے۔

مولانا محمد علی کے اس سلسلۂ مضمون کی خوبی اگرچہ اقبال کے کلام پر ان کی نظر، خصائص کلام کے ادراک، نکتہ آفرینی کے علاوہ ان کے سیاسی مقاصد و استدلال طنز و تعریض اور ان کا جارحانہ اسلوب بیان ہے لیکن ان مضامین میں ان کے طرزِ تحریر کے بعض نہایت شگفتہ و دل آویز نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً آغاز مضمون ہی میں لکھتے ہیں:

"ان خبروں کے علاوہ ہندوستان کے چھوٹے سے چھوٹے فساد کی خبریں تھیں۔ اور اخبارات کے "کٹنگز" کیا تھے، ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں اڑائی گئی تھیں۔"

لیکن اس قسم کی مثالیں خواہ دو چار اور تلاش کر لی جائیں مستثنیات کے ذیل آتی ہیں۔

مولانا محمد علی کی تحریر کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مولانا کی بنیادی حیثیت پر غور کر لیا جائے۔ محمد علی میں اللہ تعالیٰ نے متعدد خوبیوں

کو جمع کر دیا تھا۔ وہ صحافی تھے، خطیب تھے، سیاست داں تھے، شاعر تھے، ادیب تھے اور علم و عمل کے ان مختلف گوشوں میں ان کی زبان دانی اور ذہانت نے تحریرِ دانشا کی بہت سی خوبیوں کو جمع کر دیا تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود بنیادی طور پر وہ صحافی تھے۔ تحریرِ دانشا کی مشق نے ان کی نگارش کا ایک اسلوب ٹھہرا دیا تھا، لیکن وہ اصلاً ادیب نہ تھے۔ ان کی سیاست بھی ان کی صحافت کی رہینِ منت تھی۔ سیاست داں کے لیے مزاج و سیرت کے جن خصائص کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اُن کے عہد کے ہر چھوٹے بڑے سیاست داں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں، وہ ان سے یک سر نہ سہی بیشتر محروم تھے۔ سیاست میں وہ بقول قائدِ اعظم "شوٹنگ اسٹار" تھے۔ سیاست میں تدبر و شرافت کے ماحول میں "گنڈا گردی" کو انھوں نے داخل کیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ قائدِ اعظم نے انھیں سیاست سے نکال دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کی شاعری ان کے زمانہ نظر بندی کے شب و روز اور فرصت کا مشغلہ تھا۔ شاعری کا ذوق ان میں اتنا ہی تھا جتنا رام پور، علی گڑھ اور دلّی کا ادبی اور علمی ماحول ہر کس و ناکس میں پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک جوش ہے لیکن نہ فکر کی بلندی اور گہرائی ہے، نہ فن کی پختگی۔ بعض دوستوں نے علامہ اقبال کے ضمن میں ان کی شاعری کا تذکرہ کر کے عمدہ ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔ دونوں کی شاعری میں وہی نسبت ہے جو راجہ بھوج اور گنگو تیلی کے افکار اور برہمن زادے اور کلال بچے کی سیرت میں ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا محمد علی

اقبال اور محمد علی ہم عصر بھی تھے اور ہم عمر بھی، دونوں کی عمر میں ایک سال کا فرق تھا۔ اقبال کا طے شدہ سال پیدائش ۱۸۷۷ء تھا[1]۔ محمد علی ان سے ایک سال چھوٹے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۵۔ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ / ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء تھی۔ دونوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایک ہی انداز پر اسلامی ماحول میں ہوئی، اسلام سے دونوں کو دیوانہ وار محبت تھی اور دونوں ہندوستان میں اسلام کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی دونوں کی پرواز افکار و تخیلات کی ایک ہی فضا میں تھی۔ اگرچہ محمد علی شاعر کی حیثیت سے اقبال کے افکارِ بلند کی گرد کو بھی نہ پہنچتے تھے۔ لیکن اسلامی انقلابی افکار اور ملی احساسات کے لحاظ سے محمد علی اقبال سے کم نہ تھے۔ پروفیسر محمد سرور جامعی مرحوم دونوں اکابر کے تاثرات و افکار کی یک رنگی اور ہم آہنگی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "علامہ اقبال کے تاثرات مولانا مرحوم ہی کی طرح تھے۔ ان کے اس دور کے کلام میں ترک و عرب کی داستان اور اسلامیوں کا سوز و ساز بڑا نمایاں ہے۔ اور خاص طور سے ان کی مشہور نظم خضرِ راہ (۲۱-۱۹۲۰ء) میں مسلمانوں کے قلب و دماغ کی جو کیفیت تھی، اس کی پرزور ترجمانی کرتی ہے۔ برصغیر کے اسلامی ذہن میں اس کیفیت کو پیدا کرنے میں بے شک اس زمانے کے اور رہنماؤں کا بھی حصّہ ہے لیکن مرتب کے نزدیک اس کاروانِ حریت کے قائد مولانا محمد علی تھے۔"[2]

لیکن دونوں کی زندگی اور سیاست کے انداز اس درجہ مختلف تھے کہ دونوں میں زمین و

---

[1] پاکستان میں سرکاری طور پر علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء قرار پائی ہے، لیکن علمی حلقوں میں اسے صحیح تسلیم نہیں کیا گیا۔ حضرت اقبال کے بڑے بھائی کے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی، جناب مالک رام، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر وحید قریشی اور دوسرے ماہرین اقبالیات ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کے حق میں ہیں

[2] محمد سرور، مولانا محمد علی بہ حیثیت تاریخ اور تاریخ ساز، لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۶۲ء، ص ۴۸۔

آسمان کا فرق تھا۔ محمد علی عملی دنیا کے ایک دیو پیکر انسان تھے جب کہ اقبال آسمان فکر کے بلند پرواز شاہین تھے۔ محمد علی نے اصحاب عزم و ہمت کا راستہ اختیار کیا جب کہ اقبال نے شعر و نغمہ کی محفل کا رخ کیا۔ اقبال نے اپنے افکار کی تالیف و نظم کے لیے گوشہ گیری کی زندگی اختیار کی۔ محمد علی نے ایک نیا جہان آباد کرنے اور نظام کہنہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے انقلاب کی راہ میں آبلہ پائی سے محبت کی۔ اقبال نے عالم افکار میں "نیا شوالہ" منظوم شاہکار تخلیق کیا تھا لیکن محمد علی اس دنیائے آب و گل میں ایک سب سے اونچے تیرتھ کی تعمیر کے عزم کے لیے احرام سفر باندھ چکے تھے۔

محمد علی حد درجہ جذباتی اور پارہ صفت انسان تھے۔ اقبال کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا محمد علی زود اشتعال تھے، اقبال بردبار تھے، محمد علی اقبال کے ایک بیان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ہمدرد میں لگاتار پانچ مضمون اقبال کے بیان کے صرف چند جملوں پر تنقید میں لکھ ڈالے، اقبال نے ان کے پانچ تیز و تند مخالفانہ مضمون پڑھ کر بھی ایک بیان نہ دیا۔ محمد علی تقریباً ہر معاملے میں انتہا پسند تھے، اقبال میانہ رو اور اعتدال پسند تھے محمد علی الفاظ کے استعمال میں بہت بے پروا تھے۔ ان کے برعکس اقبال نے اپنی شاعری کی طرح اپنے سیاسی اور وقتی مسایل کے سلسلے میں ہنگامی بیانات میں بھی نہایت نپے تلے الفاظ استعمال کیے۔ محمد علی نے جنگ میں حدود کی کبھی پروا نہیں کی، اقبال نے ایراد و تنقید میں بھی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ اقبال نے سیاست میں اپنے مدبرانہ مقام سے شاید ہی کبھی نیچے دیکھا ہو۔ محمد علی سیاست میں اپنے عوامی کردار اور صحافیانہ سطح سے کبھی بلند نہ ہو سکے۔

لیکن ان اختلافات و تضادات کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے کے کمالات کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ زندگی، سیاسی مسلک اور سیاسی مسایل میں انداز فکر کے شدید ترین اختلاف اور تضاد کے بعد ایک دوسرے کے محاسن اور خدمات کا قطعی انکار بھی کر دیا جاتا تو ہرگز تعجب انگیز بات نہ ہوتی۔

۱۔ مولانا محمد علی نے متعدد مواقع پر علامہ اقبال کی آرا اور بعض معاملات میں ان کے رویے سے شدید اختلاف کیا۔ اختلاف کا پہلا موقع وہ تھا جب محمد علی تحریک ترک موالات کے زمانے میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں لاہور گئے اور ۲۰ر اکتوبر کو ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اور اہل لاہور کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے اٹھالیں، طلبہ کو دعوت دی کہ وہ انگریز کے قایم کردہ تعلیمی اداروں سے نکل آئیں، اور سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں کے منتظمین سے چاہا کہ وہ سرکاری امداد سے دستبردار ہوکر قومی وسائل سے اداروں کو چلائیں[۱]۔ لاہور سے محمد علی کو بڑی توقع تھی۔ اس لیے کہ لاہور کے گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے متعدد طلبہ ۱۹۱۵ء میں اپنی تعلیم ترک کرکے اور ملی غیرت، اسلامی حمیت اور خدمت اسلام کے جذبے سے سرشار ہوکر افغانستان ہجرت کر گئے تھے۔ اگرچہ ان چند طلبہ کی ہجرت کے برصغیر پاک و ہند کی اسلامی زندگی اور ملی سیاست پر اثرات نہیں پڑے تھے لیکن اہل لاہور کے سر اس ایثار اور قربانی کی بدولت بلند ضرور ہو گئے تھے۔ اس لیے محمد علی کی یہ توقع بے جا بھی نہ تھی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے انھیں خاص طور پر توقع تھی۔ محمد علی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامیہ کالج اور انجمن حمایت اسلام جو اس کالج کو چلا رہی تھی، کے ارکان ان کے ساتھ تعاون کے لیے علی گڑھ کے ارباب بسط و کشاد سے زیادہ مستعد اور آمادۂ ترک موالات تھے[۲]۔ لیکن علامہ اقبال نے جو اس زمانے میں انجمن کے سیکرٹری تھے ترک موالات کے سلسلے میں ترک تعلیم اور اس کے طریقۂ کار سے اختلاف کیا۔ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر سر محمد شفیع کی ذاتی ڈائری کے ایک اندراج سے بڑی قیمتی روشنی پڑتی ہے۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز اتوار سر شفیع اپنی ڈایری میں لکھتے ہیں:

"صبح کو شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا کو بلوایا۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا شوکت علی، مولانا

---

[۱] مشتاق احمد (مرتب) تقاریر مولانا محمد علی، میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۱ء، حصہ اول، ص ۴۸-۴۰

[۲] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ ( ) روزانہ ہمدرد، دہلی، اگست ۱۹۲۷ء ص۔

محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد گاندھی جی کے ساتھ لاہور آئے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی سرلا دیوی چودھرانی کے یہاں اور دوسرے تمام حضرات مولوی غلام محی الدین وکیل (ایک ترک موالاتی) کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان حضرات نے انجمن حمایت اسلام کے کچھ سربرآوردہ ارکان کو گذشتہ بدھ (مورخہ ۲۰ر اکتوبر) کی شام کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔ سر ذوالفقار تو نہیں گئے البتہ وہ (شیخ عبدالقادر) اور چودھری شہاب الدین اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا شوکت علی اور ان کے رفقا نے تجویز پیش کی کہ ترک موالات کے بارے میں غور کرنے کے لیے اگلے روز انجمن کی جنرل کونسل کی ایک میٹنگ بلائی جائے۔ شہاب الدین نے ترک موالات کی سخت الفاظ میں مخالفت کی۔ لیکن ان حضرات نے مشورے کے لیے میٹنگ بلانے پر اصرار کیا۔ شہاب الدین نے کہا کہ ڈاکٹر اقبال جو انجمن کے جنرل سیکرٹری ہیں، یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر اسی وقت موٹر بھیج کر اقبال کو بلوایا گیا، اقبال نے بتایا کہ اگلے روز میٹنگ بلانا تو کسی طرح ممکن نہیں ہے اس لیے کہ مفصلات کے ارکان کو اس مختصر وقت میں اطلاع نہیں کی جا سکتی۔ اس پر یہ تجویز کیا گیا کہ صرف مقامی ارکان کی میٹنگ بلالی جائے۔ اقبال نے کہا صرف ایک رات میں شہر کے تمام ممبروں پر بھی نوٹس کی تعمیل نہیں کرائی جا سکتی۔ اس صورت میں ان حضرات نے خود اس کی ذمہ داری لی۔ چنانچہ اقبال کے دستخطوں سے ایک نوٹس تیار کر کے انھیں دے دیا گیا۔

دوسرے روز (۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعرات) ایک میٹنگ ہوئی، جس میں جنرل کونسل کے پچاس ممبروں میں سے بائیس مقامی ممبر آئے اور اسلامیہ کالج میں اکٹھے ہوئے۔ شوکت علی کے ساتھیوں، جماعتوں اور طلبہ سے کالج کے کمرے اور دالان بھر گئے۔ اس موقع پر مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے تقریریں کیں۔ مولانا آزاد نے قرآن کی آیت پڑھی اور یہ فتویٰ دیا کہ اس آیت کی روشنی میں کوئی مسلمان برٹش حکومت سے موالات نہیں کر سکتا۔ شیخ عبدالقادر نے اس تجویز کی مخالفت

کی اور باوجود مجمع کی مداخلت کے انھوں نے اپنی بات پوری کی۔ ان کے بعد محمد علی دوبارہ کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر اقبال سے پوچھا کہ اب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ اقبال نے کہا کہ فتوے کی موجودگی میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے، اور انھوں نے ترک موالات کی تجویز کو جنرل کونسل کی میٹنگ میں رکھے جانے کے خیال سے اتفاق کیا۔ اس پر مجمع سے منظور ہے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد سر ذوالفقار (صدر انجمن) سے اپنی رائے ظاہر کرنے کو کہا گیا۔ انھوں نے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ فتویٰ کی موجودگی میں جس کی بنیاد قرآن پر ہے، کوئی مسلمان بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر دوبارہ منظور ہے کا شور بلند ہوا۔ محمد علی نے اٹھ کر سر ذوالفقار کو اپنے سینے سے لگا لیا اور خوشی سے ان کا منہ چوم لیا۔ پھر انھوں نے صدر کے سامنے قلم دوات رکھ دی اور تجویز کو ضبط تحریر میں لے آنے اور موجود ارکان کے دستخط کرا لینے کے لیے کہا۔ شیخ عبدالقادر نے ووٹ لینے پر اصرار کیا۔ ووٹ لیے گئے تو معلوم ہوا کہ انیس ووٹ تجویز کے حق میں اور عبدالقادر اور محبوب عالم کے دو ووٹ اس کے خلاف تھے۔ مولوی فضل دین اپنا ووٹ دیے بغیر چلے گئے اس کے بعد کالج کی امداد بند کر دینے اور الحاق کو ختم کر دینے کے مضمون پر مشتمل ایک قرارداد تحریر کی گئی۔ اور سر ذوالفقار، ڈاکٹر اقبال، شہاب الدین، اور دوسرے تمام ارکان نے جو وہاں موجود تھے دستخط کیے"[1]

سر شفیع کی ڈایری کے اس اندراج سے جو شیخ عبدالقادر کی بیان کردہ جلسہ انجمن کی روداد پر مشتمل ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال فتوے کے سامنے خاموش ضرور ہو گئے تھے لیکن مطمئن وہ ہرگز نہیں ہوئے تھے۔ اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو محمد نیاز الدین خاں کے نام جو خط لکھا ہے اس سے یہ حقیقت صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے۔ اقبال رح لکھتے ہیں:

"چونکہ واجب الاطاعت امام اس وقت موجود نہیں۔ اس واسطے جمہور مشاہیر علمائے

---

[1] افضل اقبال، دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی۔ لاہور، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۴ر، ص ۴۰-۲۳۹،

ہند کا فتویٰ ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں۔ خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ علما کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہیے۔ ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر علما کا فتوے میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سر تسلیم خم ہے۔" [1]

"ایک عالم" سے اقبال کا اشارہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف ہے جنھوں نے ۲۱ر اکتوبر کی میٹنگ میں ترک موالات کا فتویٰ دیا تھا۔ لیکن یہ صرف ایک عالم کا فتویٰ نہیں تھا بلکہ اس سے ڈیڑھ ماہ قبل ۶ر ستمبر کو کلکتہ کے اجلاس جمعیت علمائے ہند میں مذہبی احکام کی روشنی میں ترک موالات کا متفقہ فیصلہ کیا جا چکا تھا، جس میں دیوبند، لکھنؤ، بدایوں، دہلی، پنجاب کے تمام مکاتب فکر کے مستند اور مشاہیر علمائے دین موجود تھے [2] لیکن اقبال نے اس فتویٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے بجائے کالج میں چھٹی کر کے کالج بند کر دیا [3] اور جب اس سے عوام میں اشتعال پیدا ہوا تو انجمن کی سکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا [4]، اور جب ۲۱ر اکتوبر کی لاہور کی میٹنگ کے بعد ترک موالات سے اقبال کے اتفاق کا اخبارات میں ذکر آیا تو علی گڑھ یونیورسٹی کے آنریری سکریٹری کو تار دے دیا کہ جو کچھ اخباروں میں لکھا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میرے ساتھ ان کی کوئی گفتگو اس بارے میں نہیں ہوئی [5]۔ اس کے چند ماہ کے بعد جب ۱۹۲۱ء کے شروع ہی میں ترک موالات کے بارے میں علمائے ہند کا "متفقہ فتویٰ" شایع ہو گیا تب بھی وہ اس سے مطمئن نہیں تھے وہ اسے شریعت اسلامیہ کی اسپرٹ کے خلاف سمجھتے تھے [6] اور اسی لیے انھوں نے اس کے آگے سر اطاعت خم نہیں کیا اور یہی وجہ تھی کہ ترک موالات کو اقبال کا تعاون حاصل نہیں ہو سکا۔ محمد علی کے

---

[1] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۵۴ء (مکتوب مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۱ء) ص ۳۵ [2] متفقہ فتویٰ۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۱۱ء ص ۱۵-۱۳

[3] مکاتیب اقبال، محولہ بالا ص ۳۵ [4] ایضاً (مکتوب مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء ص ۳۶

[5] ایضاً (مکتوب مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء) ص ۳۵

[6] ایضاً (مکتوب مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء) ص ۳۶

سمندِ شوق و جذبات کے لیے اقبال کا یہ دھیما رویہ بھی تازیانہ تھا اور ان سے ناراض ہو جانے کی کافی وجہ تھی۔ چنانچہ وہ اس زمانے سے اقبال کو "اقبال مرحوم" کہنے لگے تھے۔[1]

۲- اقبال سے محمد علی کی ناراضگی کی دوسری وجہ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہو گئی۔ ۳ر مئی کو لاہور میں شیواجی کی برسی منائی جا رہی تھی۔ اقبال کی تقاریر سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اپنے جذبات سے ایسے مغلوب ہوئے کہ انھوں نے رات کو اچانک چند نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس میں کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ ۴ر مئی کو مسلمانوں نے اس ظلم و بربریت کا ٹھیک اسی طرح بدلہ لے لیا اور جس طرح ایک روز پہلے مسلمانوں کے خونِ ناحق سے زمین کو لالہ زار بنا دیا گیا تھا اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں کے خون سے مسلمانوں کا دامن رنگین ہوا۔ ان واقعات نے نہ صرف پورے پنجاب کی زندگی کو متاثر کیا بلکہ پورے ملک میں ان واقعات نے خوف اور بے اعتمادی کی فضا پیدا کر دی۔ محمد علی نے اس واقعے پر "فسادات لاہور" کے عنوان سے ایک پر زور مقالہ افتتاحیہ لکھا۔[2]

پنجاب کی انتظامیہ اس واقعے کی تحقیقات کروا رہی تھی۔ اس موقع پر مسلمانوں کا ایک وفد جس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے، ڈپٹی کمشنر لاہور سے ملا اور اس نے تفتیش کرنے والے ہندو عملے پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کیا، اسی قسم کا ایک وفد ہندوؤں کا بھی ڈپٹی کمشنر سے ملا اور اس نے تفتیش کرنے والے مسلمان حکام پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ یہ حالات تھے کہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کا اجلاس شملہ میں ہوا۔ علامہ اقبال اسمبلی کے رکن تھے۔[3]

اسمبلی میں ایک سکھ ممبر سردار اجل سنگھ نے ملازمتوں کو مقابلے کے امتحان سے پُر کرنے کے متعلق ایک قرارداد پیش کی۔ اس میں انھوں نے کہا:

---

[1] میرا استاد اقبال، روزانہ ہمدرد، دہلی، ۱۲ر اگست ۱۹۲۷ء ص ۴ [2] فسادات لاہور، روزانہ ہمدرد، دہلی - ۸ر مئی ۱۹۲۷ء، ص ۳ - [3] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ، روزانہ ہمدرد، دہلی - ۱۶ر اگست ۱۹۲۷ء ص ۳ -

"یہ کونسل گورنمنٹ سے سفارش کرتی ہے کہ آیندہ تمام محکموں میں سرکاری ملازمتوں کو جہاں تک ممکن ہو مقابلے کے امتحان سے پر کیا جائے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو اور انتخاب ضروری سمجھا جائے تو سب سے زیادہ مستند امیدوار کو بلا لحاظ قوم، مذہب اور رنگ منتخب کیا جائے۔"[۱۵]

علامہ اقبال نے اس رزولیوشن پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

"میں اپنے محترم دوست کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مقابلے کے امتحان کا اصول بذات خود اس ملک میں بالعموم اور اس صوبے میں بالخصوص ناقابل عمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ایوان میں بہت محترم ممبروں کو اس واقعے کا علم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ایسا غیر فرقہ وارانہ ادارہ بھی اپنے مختلف امتحانات میں فرضی رول نمبروں کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اسی طرح ممتحن کو اس امیدوار کے جس کا وہ پرچہ دیکھتا ہے، مذہب، ملت، رنگ اور کالج کے متعلق کچھ پتا نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کیوں کہ خطرہ تھا کہ ہندو ممتحن مسلمان امیدواروں کو فیل نہ کر دیں اور مسلم ممتحن ہندو امیدواروں کو (آوازیں شرم شرم) یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک شرمناک فعل ہے لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ہندو اور مسلمان امیدوار اپنے پرچوں میں بعض ایسے نشانات چھوڑ دیتے ہیں جن سے ممتحن کو اس کے مذہب اور ملت کا پتا لگ جاتے۔

کل ہی کی بات ہے کہ میں ایل ایل بی کے امتحان کے پرچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے چند پرچوں پر "۷۸۶" لکھا ہوا دیکھا جو عربی کے ایک فارمولے کے ہندسوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح دوسرے پرچوں پر "اوم" لکھا ہوا تھا، جس سے مراد ایک طرف تو خدا سے مدد مانگنا ہے اور دوسری طرف ممتحن پر امیدوار کی ملت کا ظاہر کرنا۔ ایک غیر فرقہ وارانہ ادارے میں تو صورت حال یہ ہے۔

اب ایک اور مثال لیجیے ۔ تازہ فسادات لاہور میں ہندو اور مسلمان دونوں وفود بنا کر کئی دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے، اور ہر دو وفود نے مخالف ملت کے تحقیقاتی افسروں کے خلاف شکایت کی ۔ اسی قسم کے ایک وفد کا میں بھی ممبر تھا (آوازیں شرم شرم) یہ کوئی شرم کی بات نہیں ۔ ہمیں واقعات کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنا ہے ۔ یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ صورت حال اس قدر نازک ہو چکی ہے ۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمیں جو جواب دیا وہ آپ کو معلوم ہے ۔ اور میرے خیال میں اس نے جو کچھ کہا اس میں وہ بالکل حق بجانب تھا ۔ اصلاحات کی اسکیم کے نفاذ سے پہلے پولیس میں ۱۲۰ برٹش آفیسر تھے اور اب صرف ۶۸ ہیں ۔ ہمارے برٹش آفیسروں کی تعداد کافی نہیں ہے ۔ اور دونوں فرقے یورپین آفیسر چاہتے ہیں ۔

بدقسمتی سے میرے دوست پنڈت نانک چند اس وقت یہاں نہیں ہیں انھوں نے کہا کہ حکومت نے رنگ و نسل کا امتیاز اڑا دیا ہے اور اس طرح وہ آسامیاں جو پہلے برٹش آفیسروں کو ملتی تھیں، اب ہندو اور مسلمانوں کے حصے میں آتی ہیں ۔ لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملے میں بڑی سخت غلطی کی ہے، اور اگر برٹش آفیسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا (آوازیں نہیں نہیں) جب میں یہ کہتا ہوں تو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر کے کہتا ہوں اور میں "نہیں نہیں" کی آواز کا مطلب بھی خوب سمجھتا ہوں ۔ میں اس غلط اور سطحی قومیت سے مسحور نہیں ہوں جس کا اظہار اس طریق پر کیا جائے۔" [1]

اگر گزشتہ مئی کے واقعات کے تناظر میں اس تقریر کو دیکھا جائے تو حالات پر قابو پانے اور ملک میں پائیدار امن کے قیام کے لیے یہ ایک معقول بات تھی ۔ لیکن اگر

---

[1] باقیات اقبال ص ۹۵-۹۴

انگریز کی پالیسی اور کوششوں کو دیکھا جائے تو صورت حال یہ تھی کہ لاہور کے فسادات، ڈپٹی کمشنر سے ہندو اور مسلم وفود کی ملاقاتوں اور ان کے مطالبوں اور کونسل میں تحریک وتقاریر سے حکومت اپنے مطلوبہ نتایج نکالنے میں مصروف تھی اور ان حالات سے اور اس طرح ۱۹۲۹ء میں متوقع اصلاحات کو ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے آگے لے جانے کے بجائے پیچھے لے جانے کے لیے جواز پیدا کیا جا رہا تھا۔[1] محمد علی کا خیال تھا کہ "شمع وشاعر" کا مصنف انگریز کی چال کو نہیں سمجھ رہا ہے، لندن ٹائمز اور اس کے موکلوں کا آلہ کار بن گیا ہے[2] اور اپنے رویے سے برٹش استعمار کو فایدہ پہنچا رہا ہے۔ علامہ اقبال کی تقریر کے دوران میں جب بعض ارکان نے نہیں نہیں کا شور مچایا تو اقبال نے اسے غلط اور سطحی یا جھوٹی قوم پرستی سے تعبیر کیا، محمد علی کو اس طنز نے ایسا آتش زیر پا کیا اور طیش دلایا کہ انھوں نے اس تقریر کے ہر جزو کی نہایت پر جوش تردید کی اور جب تک اکٹھے پانچ مقالے اقبال کے خلاف نہیں لکھ لیے، سکون سے نہیں بیٹھے۔ لیکن یہ دل چسپ بات ہے کہ محمد علی اس سے قبل قیام امن کے سلسلے میں علامہ اقبال کے بیانات کی تعریف کر چکے تھے۔ ۸ رمئی کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

> "میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ کس طرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر وتحمل کی تلقین فرمائی تو میرے دل سے اس سچے محب وطن کے لیے دعا نکلی۔ کاش میں اسی وقت اس کی بھی دعا مانگ لیتا کہ لاہور کے مسلمان اس کی نصیحت پر آخر تک عمل پیرا رہیں۔"[3]

چونکہ مسلمانوں نے برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے دیا تھا، اس لیے اسی مقالے میں محمد علی افسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے ڈاکٹر اقبال کی "بیش بہا نصیحت" پر آخر تک

---

[1] شاعر وطن اقبال: روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۷ر اگست ۱۹۲۷ء ص ۳

[2] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ: روزانہ ہمدرد دہلی۔ ۱۷ر اگست ۱۹۲۷ء ص ؟

[3] فسادات لاہور۔ روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۸ر مئی ۱۹۲۷ء ص ۳

عمل نہ کیا[1]

۳- علامہ اقبال کی مخالفت کا تیسرا موقع ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ہوا۔ سائمن کمیشن کے مقاطعے یا خیر مقدم کے مسئلے پر دونوں بزرگوں کی رائے ایک دوسرے کی رائے سے قطعاً خلاف تھی۔ محمد علی اسے نہ صرف یہ کہ مسایل کا حل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ملک میں افتراق و انتشار کا ایک نیا شاخسانہ تصور کرتے تھے جب کہ اقبال اس کی آمد سے اگر پُرامید نہیں بھی تھے تو اس سے مفید نتائج پیدا کرنے کے خواہاں تھے اس لیے انھوں نے اس کے خیر مقدم کرنے کی اپیل کی تھی۔ اقبال کی یہ اپیل محمد علی کے لیے گویا ع

سمندِ شوق کو اک اور تازیانہ ہوا

انھوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو سر محمد شفیع اور سر محمد اقبال کو ایک چیلنج دیا کہ وہ پنجاب کے کسی مقام پر بھی سائمن کمیشن کے مقاطعہ اور دوسرے مسایل پر مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع میں مناظرہ کرلیں[2]۔

ظاہر ہے کہ علامہ نہ مزاجاً اس قسم کے شخص تھے کہ وہ کسی سے مناظرہ و مقابلہ کریں، نہ وہ جوش و جذبات کے انسان تھے، نہ خطابت ان کا فن اور میدان تھا۔ اقبال کے نزدیک قومی اور ملی مسایل اپنے فیصلوں کے لیے غور و فکر اور تدبر و تعقل کے طالب ہوتے ہیں۔ محمد علی نے انھیں ہجوم و اقدام اور جوش و جذبات سے طے کرنا چاہا۔ بلاشبہ لاہور میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا ایک مشترکہ فقید المثال جلوس نکلا۔ لیکن اقبال کے محکم دلایل کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یوں تو قومی زندگی کے کئی اور مرحلوں میں دونوں اکابر میں اختلاف پیدا ہوا لیکن مذکورۃ الصدر مواقع ایسے تھے کہ محمد علی اور اقبال کی زندگیوں میں یادگار رہیں گے۔ البتہ ان شدید ترین اختلافات کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں اکابر ایک دوسرے کی عظمت کے منکر یا مقام سے ناآشنا تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب محمد علی بیتول جیل سے رہا ہو کر امرتسر پہنچے جہاں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ

---

[1] ایضاً [2] افضل اقبال، دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی۔ محولہ بالا، ص ۳۵۱

باغ کے اندوہناک حادثے اور پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ اور پنجاب کے شدید آزمایش سے گزرنے کے بعد امرتسر کے فیصلوں پر ملک کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ علامہ اقبال بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے، اس موقع پر محمد علی کو جو خراج عقیدت پیش کیا وہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں تھی کہ ان کا سوانح نگار اسے بھول جائے یا نظر انداز کر دے۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس میں محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھے تھے[1] ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر ناقۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند[2]

اگرچہ ان اشعار کا مضمون محمد علی کے لیے خاص نہیں بلکہ ان تمام اہل ہمت اور اصحاب عزیمت کے لیے عام ہے جو قید و بند کی آزمایش سے گزرے تھے لیکن محمد علی کا یہ اعزاز کوئی معمولی اعزاز نہیں کہ اقبال نے اس موقع پر خاص انھیں مخاطب کر کے یہ اشعار سنائے تھے۔

اس اظہار عقیدت کے چند ہی دن کے بعد جب مسئلہ خلافت کی اہمیت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی اس سے دلی وابستگی اور ان کی مرضی کے برعکس مسئلہ خلافت کے تصفیے کے نتائج سے ارباب حکومت برطانیہ کو آگاہ کرنے اور اتمام حجت کے لیے وفد لے کر محمد علی انگلستان جا رہے تھے تو علامہ اقبال اس کے نتیجے اور حاصل کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ بلکہ اتنا ہی نہیں وہ اسے مسلمانوں کی ملی غیرت اور اسلامی حمیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ "دریوزۂ خلافت" کے عنوان سے انھوں نے قطعہ لکھا[3]۔ جس میں کہا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

---

[1] مہر، غلام رسول: مطالب بانگ درا۔ لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۶ء ص ۳۰۳ [2] اقبال، کلیات اقبال (اردو) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء، بانگ درا ص ۲۵۳ [3] مہر، غلام رسول، مطالب بانگ درا، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۶ء ص ۳۰۴۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"[1]

اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اقبال کا اندازہ صحیح نکلا اور خود محمد علی نے اعتراف کیا کہ "دریوزہ گرانِ خلافت خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے"۔ علامہ اقبال کا یہ اصولی اختلاف تھا جسے انھوں نے نہایت لطیف اور شاعرانہ اسلوب میں پیش کر دیا تھا۔ محمد علی نے اسے اقبال کی ملی غیرت کا آئینہ دار سمجھا اور خوشی یا ناخوشی سے ان کے ان طعنہ ہائے دریوزہ گری و گداگری برداشت کر لیے۔ اس وقت تک ان کی مزاجی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اختلاف کو برداشت کر لیتے تھے۔ بعد میں جیسا کہ قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد دریابادی اور اُن کے دوسرے سیرت نگاروں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے جسمانی امراض، اعصابی عوارض اور ذہنی صدمات کی بنا پر وہ ذرا سے اختلاف سے بھی مشتعل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد کے حالات سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال ہی کے تعلق سے انھوں نے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا شدید اثر لیا۔

آخری موقع جب اقبال نے محمد علی کو نذرانہ عقیدت پیش کیا، وہ ہے جب ان کا لندن میں انتقال ہوا، اور بیت المقدس کی آغوش رحمت ان کی آخری آرام گاہ بنی۔ یا خاک قدس نے انھیں اپنی آغوش تمنا میں لے کر عرش بریں تک پہنچایا۔ اقبال فرماتے ہیں:

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ　　تا مژہ بر ہم زنیم از ماہ و پروین در گزشت
اے خوشا مشتِ غبار او کہ از جذب حرم　　از کنار اندلس واز ساحل بربر گزشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت　　سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست　　بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت
جلوہ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست　　گرچہ آں نور نگاہِ خاور از خاور گزشت[2]

---

[1] اقبال، کلیات اقبال (اردو) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء بانگ درا ص ۲۵۴

[2] افضل حق قرشی، قاضی، اقبال کے ممدوح علماء لاہور، مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء ص ۱۴۰

محمد علی کی بھرپور سیاسی زندگی کا آغاز کامریڈ کے اجرا سے ہوا تھا۔ لیکن کامریڈ ایک اونچے درجے کا جریدہ تھا اس کے اجرا کا مقصد ملک کی آواز کو حکومت کے اعلیٰ حلقوں تک پہنچانا تھا اس لیے اس کے اثرات عوام کے ذہنوں پر نہیں پڑے جب کہ اعلیٰ حلقوں میں ہندوستان سے لے کر انگلستان تک کامریڈ کے آوازہ شہرت سے کوہ و صحرا گونج اٹھے تھے۔ اس کے برعکس ہمدرد کے اجرا کا مقصد قوم کے حالات کی اصلاح، سیاسی اور سماجی شعور کی بیداری اور قوم کی سیاسی تربیت تھا، ہمدرد کا دایرہ اشاعت خواص سے عوام تک پھیلا ہوا تھا۔ محمد علی نے کامریڈ کے بیسیوں مقالوں میں علامہ اقبال کے اشعار نقل کیے ہیں اور اپنے افکار و خیالات کی توضیح و اثبات کے لیے ان سے استدلال کیا ہے۔ اور بعض مقامات پر ان کی نظموں کے طویل اقتباسات دیے ہیں مثلاً ۱۰ر فروری ۱۹۱۲ء کے کامریڈ کے مقالہ افتتاحیہ میں اقبال کی نظم "دعا" پوری کی پوری نقل کر دی ہے[1]۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے　　جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

اس کا آخری شعر ہے ؎

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا　　تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے[2]

اسی مقام افتتاحیہ کی تیسری قسط جو ۲۴ر فروری کو شایع ہوئی اس میں اقبال کا حوالہ دیا ہے اور ان کا یہ شعر تو گویا مقالے کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح چمک رہا ہے :

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے　　آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا[3]

کامریڈ کے ایک اور لیڈنگ آرٹیکل میں انھوں نے بنگال کے ایک مشہور خاندان کی خاتون کی بے پردگی اور ایک جلسہ تقسیم انعامات میں ان کے انداز دل ربائی و بے باکی کے سلسلے میں "پردہ" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور لکھا ہے کہ بے پردگی تو بے پردگی پردہ بھی اپنے تمام لوازم یعنی شرم و حیا کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایسے "پردہ نشینوں" سے

---

[1] نظم ضمیمے میں ملاحظہ ہو [2] دی فیوچر آف اسلام، ہفتہ وار، کامریڈ، کلکتہ ۱۰ر فروری ۱۹۱۲ء ص ۱۲۲
[3] ایضاً ۲۴ر فروری ۱۹۱۲ء ص ۱۷۱

کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی جن کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے: ع

بیٹھ کر پردے میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں[1]

اسی طرح ایک اور لیڈنگ آرٹیکل میں لکھا ہے۔ "اقبال نے کیا خوب کہا ہے" اور اس کے بعد موقع بحث کی مناسبت سے یہ شعر نقل کیا ہے: ؎

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد شیشہ گردید و شکستن بیشہ کرد[2]

خواجہ حسن نظامی کے متعلق سلسلۂ مضمون میں قوم و ملت کے غداروں کی لائی ہوئی مصیبت اور مکاروں پر اعتماد کے نتیجے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اسرار خودی میں پیروں، واعظوں اور صوفیوں کے متعلق بابائے صحرائی کے افکار کو یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے[3]

یوں تو محمد علی شروع ہی سے اقبال کے مداحوں میں سے تھے[4] اور اقبال کا جو کلام اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا تھا اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن ابھی ان کے نزدیک اقبال کا وہ مقام متعین نہیں ہوا تھا جو بعد میں اسرار خودی اور رموز بے خودی کے مطالعے کے بعد ہوا۔ اسرار خودی کے مطالعے کے بعد تو وہ اس سے بالکل مسحور ہو گئے، لیکن وہ اقبال کو ہندوستان کے اکابر اور بلند پایہ شعرا میں تو ۱۹۱۲ء میں بھی سمجھتے تھے جبکہ انھوں نے ہمدرد نکالنے کا فیصلہ کیا تھا اور اقبال سے ہمدرد کے لیے پیغام طلب کیا تھا ضیاء الدین برنی مرحوم لکھتے ہیں:

"جب ہمدرد نکالنے کے سامنے انتظامات مکمل ہو گئے تو مولانا (محمد علی) نے اپنے دوست ڈاکٹر اقبال کو پیغام کے لیے لکھا۔ یہ پیغام پہلے نمبر میں نہ نکل سکا۔ دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں

---

[1] مراکوئس پروگریس، کامریڈ، دہلی۔ ۲۱۔ مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۵

[2] دی ڈے آف اور ڈیفیٹ، کامریڈ۔ دہلی۔ ۲۴۔ اپریل ۱۹۲۵ء، ص ۲۵۳

[3] ایڈیٹروں سے خطاب: ایک نئے اسماء الرجال کی ضرورت، روزانہ ہمدرد، دہلی، ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء، ص ۲

[4] افضل اقبال، دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، محولہ بالا، ص ۱۵۴

شایع ہوا۔ وہ پیغام یہ ہے:

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی | تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا | جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں | تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے[1]

برنی صاحب کے بیان کا اتنا حصہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ پیغام ۲۰ر فروری ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا تھا اس لیے کہ ہمدرد کا پہلا پرچہ یکم جون ۱۹۱۳ء کو شایع ہوا تھا شاید ۲۰ر فروری ۱۹۱۴ء کا شمارہ ہوگا لیکن اس صورت میں بیان کا وہ حصہ مخل نظر بن جاتا ہے کہ یہ پیغام تھا جو ہمدرد کے پہلے نمبر کے لیے طلب کیا گیا تھا اس لیے کہ پیغام کتنا ہی موخر مان لیا جائے تو ماہ کی تاخیر تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں بات وہ صحیح ہے جو محمد علی کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ایک نظم تھی جو اقبال نے ہمدرد میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔

محمد علی نے ہمدرد کے مقالے میں اس نظم کا ذکر کیا ہے، اور اسے اقبال کی کرم فرمائی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب ہمدرد پہلی بار شایع ہونا شروع ہوا تو میرے کرم فرما "اقبال" نے "پھول" کے عنوان سے ایک نظم ہمدرد کے لیے ارسال کی تھی۔ جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں | تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے[2]"

لیکن اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ محمد علی نے اس شعر کو اپنی زندگی کے انداز، دوسروں پر جرح و تعدیل، تنقید اور دوسروں سے ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہنے کی خو کے جواز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم میں اور شعار بھی ہیں، اور اس سے زیادہ بلند فکر لیکن محمد علی کو اپنے مزاج کی تصویر اس شعر میں نظر آئی۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ محمد علی کی شخصیت اس نظم کے فکری معیار

---

[1] عظمت رفتہ، کراچی تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء ص ۵۰

[2] صدٌ عن سبیل اللہ، روزانہ ہمدرد، دہلی ۵ر اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۲

پر پوری نہیں اترتی - محمد علی اقبال کو اقبال مرحوم کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیں لیکن خود محمد علی کے بارے میں اب جو حقایق منظر عام پر آ رہے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آخر تک جہانِ رنگ و بو سے قطع آرزو نہ کر سکے تھے جو شخصیت کے خزاں ناآشنا بننے کے لیے اقبال کا پیغام تھا۔

محمد علی کے افکار پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے انھوں نے سیاست و مدبر اقبال کی آرا سے اختلاف کیا لیکن ان کے شاعرانہ مقام کو پہچاننے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی۔ محمد علی کا مریڈ کے ایک مضمون میں جس کے متعلقہ اقتباس کا ترجمہ سید حادر نے کیا ہے، لکھتے ہیں :

"اقبال کی شاعری کی جب میں نے ایک جھلک ہی دیکھی تھی، اس سے سالہاسال پہلے دوسروں کو اقبال کے نابغۂ عصر ہونے کا احساس ہو چلا تھا۔ لیکن اتنا دعوے تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ اس کے افسوں کے زیر اثر آنے کے بعد میں تلافی مافات میں دل و جان کے ساتھ لگ گیا۔ اس کی گریز خو نظموں (ابھی تک وہ رسالوں میں ہی چھپ رہی تھیں) کو جو رسالوں اور اخباروں میں ہاتھ آجاتیں میں بار بار پڑھتا اور اس فراواں حظ میں اپنے اخباروں کے قارئین کو بھی شریک کرتا۔

اقبال بیسویں صدی کے ہندوستان میں بیداریٔ اسلام کا شاعر تھا اور اسلامی ہند کسی اور انسان کا اس حد تک رہینِ منت نہیں جس قدر وہ مرہونِ احسان ہے۔ لاہور کے اس منکسر مزاج، شرمیلے اور عزلت گزیں بیرسٹر کا۔ اردو بولنے والی اسلامی دنیا میں گھر گھر اس کا نام لیا جاتا تھا، اور میں تو ایک پرجوش عاشق اور پرستار تھا ہی۔ میرے بھائی کی تقریریں اقبال کی شاعری سے بھری ہوئی ہوتیں جن کو وہ پرستارانہ جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے۔ میں اپنے رشک کو چھپا نہ پاتا اور ٹھٹھول کرتے ہوئے کہتا کہ آپ تو حاضرین کو متاثر اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کر لیتے ہیں محض اقبال کی نظموں کے اقتباسات سے، حالاں کہ خود آپ کی اونگھتی ہوئی خطابت ایڑ لگا لگا کر

بہ صد مشکل انھیں صرف دُلکی چال چلا سکتی ہے؛ لیکن جب شوکت کو پتا چلا کہ اقبال نے فارسی میں شاعری شروع کر دی ہے، اور ہم دونوں نے جو فارسی رام پور کے مکتب میں سُرخ داڑھی والے مولوی صاحب سے پڑھی تھی وہ اقبال کو سمجھنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئی؛ جیسے ہی اس بے بسی کا شوکت کو احساس ہوا، انھوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کے اپنے محبوب شاعر کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔[1]

دونوں اکابر کے مابین دوستانہ تعلقات بھی تھے اور ۱۹۱۵ء میں کامریڈ کے مقدمے کے سلسلے میں جب محمد علی لاہور تشریف لے جاتے تھے تو ان کا قیام اقبال کے دولت کدے پر ہوتا تھا۔ اور اس بات سے تو تعلقات کا درجہ بھی متعین کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کی مثنویات اسرار خودی اور رموز بے خودی شائع ہوئیں تو بطور "ہدیۂ مودت" یہ تحائف محمد علی کو بھی پہنچے۔ اسرار خودی کو پڑھ کر تو محمد علی بہت متاثر ہوئے اور اسی زمانے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو جو خط لکھا اس میں عقل اور قرآن کی رہنمائی کی بحث میں ہدایت قرآن کی ترجیح کے لئے اسرار خودی کے بیالیس شعر نقل کر دیے۔ شروع میں اس کے پیام پر یہ کہہ کر روشنی ڈالی ہے:

"خدا کی رحمت ہو اقبال پر خوب تعلیم مولانا روم کا اتمام کر رہا ہے۔"[2]

اس کے بعد مثنوی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

پر زن و از جذبِ خاک آزاد باش — ہمچو طائر ایمن از افتاد باش
تو اگر طائر نہ اے ہوشمند — بر سرِ غار آشیانِ خود مبند
اے کہ باشی در پئے کسبِ علوم — با تو می گویم پیامِ پیرِ روم
"علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود"
آگہی از قصۂ اخوند روم — آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم
پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل — کشتیش طوفانیِ "ظلماتِ" عقل

---

[1] حامد، سید: جوہر کی شخصیت — ادبی اور غیر ادبی، (مقالہ) مولانا محمد علی — شخصیت اور خدمات (مرتبہ سید نظر برنی) نئی دہلی۔ ادبی سنگم، ۱۹۷۶ء ص ۳-۲۰۲ [2] عبدالماجد دریا بادی، خطوط مشاہیر، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۹ء (اشاعت ثانی) ص ۲۹-۲۲۷۔

موسیٔ بیگانۂ سینائے عشق   بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت   وز حِکَم صد گوہرِ تابندہ سفت
عقدہائے قولِ مشائیں کشود   نورِ فکرش ہر خفی را وانمود
گرد و پیشش بود انبارِ کتب   بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب
پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال   جُست راہِ مکتبِ مُلّا جلال
گفت این غوغا و قیل و قال چیست   این قیاس و وہم و استدلال چیست
پائے خویش از مکتبم بیروں گذار   قیل و قال است این ترا با وے چہ کار
قالِ ما از فہمِ تو بالاتر است   شیشۂ ادراک را روشنگر است
حرفِ مُلّا شمس را حدت فزود   آتشے را جانِ تبریزی کشود [۱]
بر زمیں برقِ نگاہِ او فتاد   خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد
التہابِ دل خس ادراک سوخت [۲]   دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق !   ناشناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق
گفت این آتش چساں افروختی   دفترِ اربابِ حکمت سوختی
گفت شیخ اے مسلمِ زنّار دار   ذوق و حال است این ترا با وے چہ کار
حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است   شعلۂ ما کیمیائے احمر است
ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ   از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ
آتشے افروز از خاشاکِ خویش   شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش
علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است   معنیٔ اسلام ترکِ آفل است

چوں ز بندِ آفل ابراہیم رست
درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست

علمِ حق را در قفا انداختی   بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی

---

۱ مثنوی میں اب یہ شعر ہے : سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود   آتشے از جانِ تبریزی کشود

۲ اب مثنوی میں یہ مصرع اس طرح ہے :

آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت

گرم رو در جستجوے سُرمۂ — واقف از چشمِ سیاہِ خود نہٗ
آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب — از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگِ اسود از درِ بت خانہ خواہ — نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے — کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے
مُدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — رازدانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند — محرمِ ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارِ عبرتے — چوں گُلِ کاغذ سرابِ نکہتے
تا ز بندِ ایں گلستاں رستہ ام — آشیاں بر شاخِ طوبےٰ بستہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است — بُت پرست و بت فروش و بت گر است
پا بہ زندانِ خطابر بستۂ[1] — از حدودِ حس بروں ناجستۂ
در صراطِ زندگی از پا فتاد — بر گلوے خویشتن خنجر نہاد
آتشے دارد مثالِ لالہ سرد — شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد
فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند — در جہانِ جستجو ناشاد ماند
عشق افلاطونِ علّت ہائے عقل — بہ شود از نشترش سودائے عقل
جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق — سومناتِ عقل را محمودِ عشق

ایں مۓ دیرینہ در میناش نیست
شورِ یارب، قسمتِ شبہاش نیست

اس مثنوی سے وہ اس درجہ متاثر ہیں کہ اس کے لیے وہ "مثنوی شریف" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے ادبی پائے پر ان الفاظ سے روشنی ڈالتے ہیں:

"لکھنے بیٹھا تھا خط۔ مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بہ حیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اتنا ہی اونچا ہے جتنا کہ زمین سے آسمان کا، اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال سے مرجح سمجھتے ہیں اس لیے اسرارِ خودی کا یہ حصہ نقل کر دیا۔ امید ہے کہ تشفی ہو گئی ہو گی۔"[2]

---

[1] اب مثنوی میں اس مصرعے کی شکل یہ ہے: "پا بہ زندانِ مظاہر بستۂ" [2] خطوط مشاہیر بحوالہ بالا ص ۲۲۹

اتنا ہی نہیں محمد علی نے اسرار خودی اور رموز بے خودی کے بارے میں ایک مضمون میں قدرے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اسرار خودی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ہم نے محسوس کیا کہ اقبال کی یہ مثنوی گزشتہ کلام سے کہیں زیادہ بلند ہے اور اس کے ذریعے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں جو اردو کے ذریعے ممکن نہ تھا۔ ان کے آتش فشاں اردو کلام کے مقابلے میں ابتداً ان کی مثنوی بے جان اور سرد معلوم ہوئی لیکن جوں ہی ابتدائی باب ختم ہوا جس میں انھوں نے اپنے فلسفے کا موضوع پیش کیا ہے اور اپنے مشرقی مطالعہ کنندگان کے آگے پرانی اصطلاحات کے نئے معنوں کی وضاحت کی ہے اور جس کے بعد وہ بجائے پی ایچ ڈی کے شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ مرمر کی مورتوں میں بھی زندگی کا سیل آتش دوڑنے لگا ہے۔

کامریڈ کی ضمانت کے مقدمے میں جب مجھے متعدد مرتبہ لاہور جانا پڑا تو میں نے ان کی زبان سے ان کی مثنوی کے بعض حصے سنے تھے، جب کہ وہ لکھی جا رہی تھی۔ لیکن جس طرح کہ قرآن کے معاملے میں ہوا تھا، یہاں بھی سامنے کے درختوں کو دیکھ کر پیچھے کے عظیم الشان صحرا کا اندازہ نہ لگا سکا تھا۔ لیکن جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا بہ تدریج پورا خاکہ میری نظروں کے سامنے آتا گیا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ فلسفی شاعر اپنے انوکھے انداز میں اسلام کے ان ہی بنیادی حقایق کو پیش کرتا ہے جن کا خود میں نے بہ تمام مشکل ادراک کیا تھا۔"[1]

اقبال کی جب دوسری مثنوی شائع ہوئی تو انھوں نے وہ بھی محمد علی کو تحفہ بھیجی۔ محمد علی نہ صرف اس کے مطالعے سے محظوظ ہوئے بلکہ اس کے بارے میں اپنے تاثرات بھی بیان فرمائے۔ لکھتے ہیں :

"اقبال کی دوسری مثنوی "رموز بے خودی" اس شاہراہ کی نشان دہی کرتی ہے

---

[1] احمد اشرفناں (مترجم) تعلیمات اقبال از مولانا محمد علی (مقالہ) آثار اقبال۔

جس کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام ان کی پہلی مثنوی "اسرار خودی" نے کیا تھا۔ اور اب منزل مقصود کا پالینا ایک اندھے کے لیے بھی دشوار نہ تھا۔ جب تک ایک متعین مقصد کے ذریعے راستہ صاف نہ کیا جائے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے زندگی ایک صحرا ہے اور خود آگہی یعنی خودی کی حقیقت کو پالینا گویا زندگی کے مقصد کو پالینا ہے۔ یہی وہ مشیت الٰہی ہے جس کے لیے حکومت الٰہی کا کائنات پر ظہور ہوا۔ جب ایک دفعہ آدمی مقصد حیات اور کائنات کی مخلوقات میں جاری و ساری مشیت الٰہی کو پالیتا ہے تو درمیانی تمام مزاحمتیں تاراج ہو جاتی ہیں۔ حقیقی انا (خودی) کا ادراک اور اقدار گویا غیر حقیقی انا کو نابود کرتا ہے اور زندگی کی اپنی ناگزیز جنگ جوئی کے ساتھ اسلام کے دیرپا امن عامہ کے دامن میں عافیت پاتی ہیں۔

اسلامی پیغام اور اس کے دستور کے اہم خدوخال کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے بھی قومیت کی مذمت کی ہے جو انسانی ہمدردیوں کے حلقہ اثر کو محدود کر دیتی ہے اور نوع انسانی میں تفریق و تشتت کا باعث ہوتی ہے۔[1]"

شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ تحریک ترک موالات کے زمانے میں محمد علی کو اقبال سے شکوہ پیدا ہو گیا، اور وہ اپنے جوش و جذبات کی فراوانی میں اقبال کو "اقبال مرحوم" کہنے لگے تھے۔ لیکن ان کی شاعرانہ عظمت سے مجال انکار نہ تھی۔ اقبال کے اسلامی افکار کے حسن و کمال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال کی شاعری سے مولانا محمد علی اس قدر متاثر تھے کہ جامعہ ملیہ کے طلباء کو پڑھاتے تو قدم قدم پر اقبال کے اشعار پڑھتے اور لطف لے لے کر سناتے۔[2]"

اعظمی صاحب کی رائے کی بنیاد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے ایک بیان پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب

---

[1] ایضاً ص

[2] جامعہ دہلی (اقبال کی یاد میں) بابت جنوری - مارچ ۱۹۷۸ء ص ۱۴

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی دور کے طلبہ میں سے تھے اور اس طرح محمد علی کے شاگرد تھے وہ اپنی خودنوشت "یادوں کی دنیا" میں لکھتے ہیں :

"..... مولانا محمد علی کلچر کے دوران میں اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی کے اشعار کی توضیح کرتے لڑکے ہیں کہ نوٹ لکھ رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا نے جو فرمایا اس میں سے کچھ رہ جائے لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی کوشش کرتے ..... مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا پڑ جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ ان کے دینی جذبے کا اخلاص غیر مشتبہ تھا، اس لیے ان کی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی"[1]

مولانا محمد علی کی تحریروں سے ان کے اقبال سے متاثر ہونے کی ابتدائی تاریخ کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء تک اقبال سے کس حد تک متاثر اور ان کے کلام کے کیسے گرویدہ و شایق ہو چکے تھے۔ اس کی روداد ان ہی کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں :

"کل کا مضمون ختم کرنے کے بعد تھک تھکا کر میں پلنگ پر لیٹ گیا اور جی چاہا کہ گرامو فون پر کچھ گانا سنوں۔ ۱۹۱۱ء کا ایک ریکارڈ لگایا گیا اور میرے برادر عزیز منظور محمود صاحب نے اپنی دلکش آواز پھر سولہ برس بعد مجھے سنائی۔ پہلا شعر ہی ایک تیر کی طرح جگر کے پار ہو گیا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

میں نے منظور صاحب (مرحوم) کو علی گڑھ کالج سے اسی کو سننے کے لیے بلایا تھا اور سن کر قلب پر اتنا اثر ہوا تھا کہ اٹھ کر سیدھا گرامو فون کمپنی کے منیجر کے پاس چلا گیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ اس کا ریکارڈ تیار کر دیں۔ منظور صاحب طالب علم تھے۔ گویّے نہ تھے۔ انھیں کوئی معاوضہ لینا مقصود نہ تھا مگر مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک رقم کا انتظام کر لیا گیا جو ہر ریکارڈ کے فروخت ہونے پر اسے ملتی رہے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں کمریڈ

---

[1] یوسف حسین خاں، یادوں کی دنیا۔ اعظم گڑھ۔ معارف پریس، ۱۹۶۷ء، ص ۸۹ - ۸۸

ہیں اس کے پورے صفحے کے اشتہار نکلنا شروع ہوئے اور اگر اسی مہینے میں جنگ طرابلس کے چھڑ جانے سے کفر و اسلام کی جنگ کہ وہ سلسلہ نہ چھڑ جاتا جو کہیں بارہ برس بعد جاکر صلح لوزان پر ختم ہوا۔ اور کامریڈ کے صفحات کو جس نے جدال و قتال کے حالات سے لبریز کر دیا تھا اور اسی پیمانے پر یہ اشتہار نکلتا رہا پھر بھی مدتوں تک نکلتا رہا۔[۱]

محمد علی نے اس اشتہار کی سرخی کے لیے یہ الفاظ منتخب کیے تھے!

"دلآویز نظم، دلکش آواز، قومی امداد۔ ہم خرما و ہم ثواب"۔

اقبال نے اس اشتہار کے لیے جو پورے صفحے کا مضمون بنایا تھا اس میں انھوں نے "ترانہ ملی" پر نہایت دل فریب تبصرہ اور اقبال کے کلام کی خصوصیات اور شاعرانہ کے محدود دایرے سے رفتہ رفتہ اسلامیت کی طرف ان کے میلان پرواز کا بھی اشارہ ستا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے ہم وطنوں کے حب وطن کا اظہار ایک "بے مثل" نظم میں کیا تھا۔ جو ہندوستان میں مقبول خاص و عام ہو چکی ہے۔[۲]

اب اپنی تازہ ترین نظم میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے حب اسلام کا اظہار کیا ہے، اور یقیناً اس کی مقبولیت عالم گیر ہوگی۔ وطن اور مذہب کے تعلق کی بابت شاعر ایک شعر میں وہ مطلب ادا کر گیا ہے جو فلسفی کئی صفحوں میں ادا کرتے اور شاید پھر بھی ادا نہ کر سکتے۔ اسلاف کے کارنامے اور شعرا بھی بیان کر چکے ہیں۔ قوم کے اقبال کا ماتم بہت کچھ ہوا اور ہوگا۔ مگر اقبال نے صاف بتایا ہے کہ جس قوم کو مسبب الاسباب کی طرف سے ایک ضروری پیغام بطور ودیعت کے سونپا گیا ہو جب تک سارے عالم کو وہ پیغام نہ پہنچایا جا سکے

---

[۱] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۴)، روزانہ ہمدرد، دہلی - ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء ص ۳

[۲] اشارہ ترانہ بندی کی طرف ہے [۳] اس نظم سے مراد ترانہ ملی ہے۔

اس وقت تک اس کو تباہ و برباد کرنا آسان نہیں۔ اسلامی دنیا کے دیرینہ تنزل کے بعد اب پھر ہر طرف سے ترقی کی صدائیں پیام امن بن کر آ رہی ہیں۔ کاروان سالار اب بھی وہی ہادیٔ قوم ہے جس کی آواز نے بجلی کے کڑکے کی طرح اب سے تیرہ سو برس پہلے ایک عالم کو سوتے سے جگا دیا تھا اور اقبال کا ترانہ دراصل بانگ درا ہے جس سے آواز آ رہی ہے کہ چلو، بڑھو، جلدی کرو۔ عجب نہیں کہ یہ دلکش نظم اقبال کی نجات کے لیے کافی ہو اور ہندوستان کے مسلمان بھی پکار اٹھیں، لبیک، لبیک یارسول اللہ۔ کون ہے جس کے کان میں یہ بانگِ درا نہیں پڑی[1]

اقبال کی شاعری اور ان کے پیام کے مقصود اصلی اور اقبال کے سیاسی رویے کے بارے میں انھوں نے جو پانچ مضمون اگست ۱۹۲۷ء میں لکھے تھے ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علی کی نظر اقبال کی شاعری اور ان کے پیام کے ہر پہلو پر تھی، اور آغاز شاعری سے اس وقت تک ان کے ذہنی انقلابات اور فکری و شعری ارتقا کے ہر مرحلہ و فراز سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں:

"اپنی اردو نظموں کے مجموعے کا نام انہوں نے بانگ درا رکھا ہے اور اسی "ترانہ ملی" سے لیا گیا ہے ع

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا[2]

اقبال کی شاعری کا وہ دور جو ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے، ان کی ملی شاعری کا درخشندہ دور ہے۔ محمد علی نے اس دور کی شاعری پر تفصیلی بحث اور بعض نظموں پر نہ صرف ادبی تبصرہ کیا ہے بلکہ اقبال کے افکار کا ناقدانہ جایزہ بھی لیا ہے۔ ان کے خیال میں اس دور کی شاعری کا لب لباب بھی "ترانہ ملی" ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری کا جو تیسرا دور ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے

---

[1] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۴) روزانہ ہمدرد، دہلی، ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء ص ۳۔

[2] ایضاً ص ۴۔

اس کی ابتدا ان کی دو نظموں (بلاد اسلامیہ اور گورستان شاہی) سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اس تمام دور کی شاعری کا لب لباب اور "مشتے نمونہ از خروارے" وہی "ترانۂ ملی" تھا ..... آج کون ہے جس نے یہ ترانہ نہیں سنا ہے لیکن پھر دل مجبور کر رہا ہے کہ اس کے وہ شعر نقل کر دوں جن میں ملت اسلامیہ کی تفسیر حیات اور ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر کا اظہار کیا گیا ہے"۔[1]

یہ اس ترانۂ ملی کی ایک اہم خصوصیت ہے جس کی طرف مولانا محمد علی نے اوپر کی عبارت کے آخری جملے میں اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ترانے کے اشعار نقل کیے ہیں یہ اشعار محمد علی کا انتخاب ہیں جن میں ملت اسلامیہ کی تفسیر حیات کی گئی ہے اور بہ حیثیت مسلمان ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر بھی ہے۔[2]

ترانۂ ملی کے بعد وطنیت پر اقبال کی نظم ہے۔ اس پر اور اس کے مختلف اشعار پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

"ترانۂ ملی" کے بعد "وطنیت" پر اقبال کی نظم ہے جس کا پہلا بند یہ ہے:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے،
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"[3]

اس کے بعد محمد علی لکھتے ہیں:

"اور اس نظم میں وہی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جن کا "رموز بے خودی" میں اسلام کو تہذیب مکانی سے آزاد ظاہر کرنے کے متعلق اظہار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے وطنیت کی تقسیم کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسلام کی قومیت ساری نوع انسانی پر حاوی ہے اور اقبال نے طارق کے

---

[1] ایضاً ص ۳   [2] ایضاً   [3] ایضاً

منہ سے اس کا خیال بہترین طریقے پر ظاہر کر دیا ہے۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اپنی اردو نظموں کے مجموعے کا نام انھوں نے "بانگِ درا" رکھا ہے اور وہ اسی ترانہ ملی سے لیا گیا ہے جس کے ذکر سے اس مضمون کی ابتدا کی گئی تھی۔ یہ یقیناً ع

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

اور اس نے اقبال کے پہلے خیال کی کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تردید کر دی اور اس کی اس طرح تصحیح کر دی کہ

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا[1]"

لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا چاہیے کہ محمد علی ہندوستانی قومیت کے دعوے کو ترک کر دینا چاہتے تھے یا اقبال ہی کا یہ مقصود تھا۔ میں ان اہل علم اور اصحاب فکر کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ اقبال کی شاعری کے تیسرے دَور کے افکار نے پہلے دور کے قوم پرستانہ افکار و خیالات پر خط تنسیخ پھیر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے اور تیسرے دور میں اقبال کے افکار میں وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے دور کے افکار رد نہیں ہو جاتے۔ قومی زندگی میں ان کا بھی مقام ہے لیکن اب اقبال کے سامنے ملی شاعری کا بھی ایک وسیع میدان پیدا ہو گیا تھا۔ اگر پہلے دور کی شاعری میں قومی زندگی کے ناگزیر تقاضوں کا اظہار ہوا ہے تو بعد کے دور کی شاعری میں ملت کی تعمیر و تربیت اور تطہیر فکر کی زیادہ ضرورتوں کی طرف انھوں نے عنانِ فکر کو موڑ دیا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محمد علی یا اقبال ملت پروری کے جوش میں ہندوستانی قومیت کے استحقاق سے دست بردار ہو جانے کے لیے تیار تھے۔ محمد علی نے جو یہاں اقبال کے کلام کے ناقد نہیں شارح ہیں، صاف صاف کہہ دیا ہے:

---

[1] ایضاً ص ۴

"بے سوچے سمجھے کمال تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کمیونلزم یا ملیت۔ نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے۔ اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبے اور خاندان کی پرورش اور ان کی تعمیم سے منع کرتا پھرے۔"[1]

اس سے آگے محمد علی اقبال کی ملی اور قومی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ ہے ۱۹۰۸ء سے آج تک ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ملت پروری کا نتیجہ یقیناً آج جب کہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا ہے یہ کہنا قطعاً جھوٹ ہے کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

اور یہ تو اس سے بھی زیادہ جھوٹ ہے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

لیکن کیا یہ اس سے زیادہ سچ ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"[2]

لیکن یہ خیال کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"، بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب کہ عرب و حجاز تک میں قومیت کی تحریک برگ و بار پیدا کر چکی تھی اور "عرب عربوں کا ہے" نہ صرف خیال پیدا ہوا تھا اور صرف نعرہ بلند ہوا تھا بلکہ شریف حسین حجاز کا گورنر ترکوں سے، مسلمانوں کی اجتماعی قوت سے بغاوت کر چکا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کا ہندوستانی قومیت کے حقوق سے دستبردار ہو جانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہوتا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں یہ صورت حال بڑی خطرناک ہوتی۔ محمد علی کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"چین انگریزوں کا ہے، امریکنوں کا ہے یا جاپانیوں کا ہے یا شاید روسیوں کا ہو

---

[1] انڈین نیشنل یونین، روزانہ ہمدرد۔ دہلی، ۵۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۲

[2] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۴) روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۷، ص ۴

جائے یا (خدا کرے) پھر چینیوں کا ہو جائے جہاں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصا عنصر ہے لیکن یقیناً ہمارا تو آج ہرگز نہیں اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں کا یا یہودیوں کا یا نجدیوں اور یمنیوں کا .... عرب بھی ہمارا نہیں۔ رہا ہندوستان تو بظاہر وہ اب لالہ لاجپت رائے کا ہے"[1]

محمد علی نے اقبال کے کلام کے مختلف ادوار پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اقبال کے قومی جذبات پر نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے، اور کئی نظموں کی تو انھوں نے اچھی خاصی شرح لکھ دی ہے اقبال کی شاعری کے ادوار کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک محدود تھا اور ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت اور نیا شوالہ سب اسی دور کی نظمیں ہیں۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دوسرا دور چلا اور ۱۹۰۸ء سے وہ آخری دور چلنا شروع ہوا جو بظاہر اب تک چل رہا ہے۔ اس دور کا آغاز "بلاد اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے"[2]

اب ہم ہر دور کی شاعری اور خاص خاص منظومات کے بارے میں ان کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اقبال کی سب سے پہلی نظم جو قومی جذبات کی فراوانی کی وجہ سے محمد علی کی توجہ کا مرکز بنی، "ترانۂ ہندی" ہے۔ محمد علی نے اسے "بے مثل نظم" قرار دیا ہے اور اس کی تعلیم ان کے نزدیک "نہایت ہی صحیح تعلیم" تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

"اقبال صاحب یقیناً ایک زمانے میں تو قوم پروری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے "ترانۂ ہندی" تصنیف فرمایا اور اس کے ذریعے سے ہمیں یہ "نہایت ہی صحیح تعلیم" دی کہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"[3]

---

[1] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۳) روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۷ اگست ۱۹۲۷ء ص ۴

[2] " " " (۴) " " " ۱۹ " " ص ۳

[3] " " " (۳) " " " ۱۷ " " ص ۴

محمد علی نے اس نظم کے ایک مضمون سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان کا یہ اختلاف ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"اسی ترانے میں انھوں نے ہندوؤں کی ترجمانی کرکے فرمایا ہے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

کم سے کم ایک مسلمان کی حیثیت سے تو مجھے افسوس ہے کہ یونان و مصر و روما کی طرح ہندوستان میں بھی بت پرستی اور اسی قسم کے توہمات کا خاتمہ نہیں ہوا، اور زیس اور جوپیٹر اور وینس، آئسس اور اسارس کی طرح ہندوستان کے بھی دیوتا اور دیویاں اپنے پوجنے والوں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو گئیں۔"[1]

لیکن میرا خیال ہے کہ اقبال نے ان اشعار میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کی طرف محمد علی کا انتقال ذہنی ہوا۔ اقبال "کچھ بات ہے" سے جس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کیا وہ توہمات اور بت پرستی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہے۔

محمد علی کو "ترانۂ ہندی" بہت پسند تھا، لیکن وہ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" کو ترانۂ ہندی پر ترجیح دیتے تھے ان کے نزدیک یہ گیت، ترانے سے زیادہ صحیح خیالات کی تعلیمات دیتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت باوجود اس مشتبہ شعر کے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

"ترانۂ ہندی" سے میرے نزدیک صحیح تر خیالات کی تعلیم دیتا ہے۔"[2]

لیکن انہوں نے اس گیت کے مذکورہ بالا شعر کو "مشتبہ" قرار دیا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے

---

[1] ایضاً ص ۴ — [2] ایضاً ص ۴

کہ اس میں جنت سے موازنے کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور محمد علی کی مذہبیت کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی یا ان کے ذہن میں جنت کی زندگی کا جو تصور ہے ہندوستان کی خوش گوار فضا اس کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

محمد علی نے "ترانۂ ہندی" کے پہلے شعر پر بھی تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ترانۂ ہندی . . . جس کا مطلع ہے کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

میرے نزدیک تو باوجود میری اس قوم پروری کے بھی . . . . . ہندوستان سارے جہاں سے اچھا نہیں اور جو محبت میرے دل میں ہندوستان کی ہے وہ اسی جذبے کی بنا پر ہے کہ ؎

حبِ وطن از ملک سلیماں خوش تر خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوش تر

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد می گفت گدا بودنِ کنعاں خوش تر[1]

یہاں محمد علی نے معاملہ خود صاف کر دیا یعنی وہ جس جذبۂ محبتِ وطن کی بنا پر اپنے وطن کے خاروں کو سنبل و ریحان پر اور اپنے وطن میں گدائی کو یوسفؑ مصر کی بادشاہی پر ترجیح دیتے ہیں یہی جذبہ اقبال کے دل میں بھی موجزن تھا جس کی بنا پر وہ اپنے وطن کی فضاؤں میں سانس لینے کو جنت کی زندگی سمجھتے تھے اور جس گلستان کی وہ بلبل تھے اسے سارے جہانوں کے گلستانوں سے اچھا خیال کرتے تھے۔

محمد علی "نیا شوالہ" سے بھی بہت متاثر تھے وہ ان کے نزدیک اقبال کی سچی قوم پرستی تھی اور اقبال سچی قوم پرستی کے ترجمان اور نمایندے تھے۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"جب نیا شوالہ لکھنے کا وقت آتا ہے تو اقبال سچی قوم پروری کے ترجمان اور نمایندے بن کر کیا خوب فرماتے ہیں"[2]

اس کے بعد محمد علی نے اس نظم کے نو منتخب اشعار نقل کیے ہیں۔ اور کیا ادب اور کیا قوم پرستانہ جذبات ہر دو لحاظ سے اس نظم کو "بے مثل نظم" لکھا ہے۔ اقبال اس نظم میں قومی

---

[1] ایضاً ص ۴ [2] ایضاً ص ۴

جذبات اور خیالات کی جس بلندی پر کھڑے نظر آتے ہیں اس سے بہتر اور اس سے زیادہ بلند جذبات اور خیالات کا اظہار آج تک کوئی نیشنلسٹ مسلمان بھی نہیں کر سکا لیکن محمد علی کے عزائم اس سے بھی بلند ہیں ان کی اولوالعزمی کے سامنے فضائے بسیط کی وسعتیں تنگ ہیں۔ وہ بھی ایک تیرتھ تعمیر کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسا تیرتھ جس کا کلس دامن آسمان سے نہ ملا ہو بلکہ اس منارہ آسمان سے بھی بلند ہو۔ محمد علی خواہ شاعرانہ مقام میں اقبال کے برابر نہ پہنچ سکے ہوں لیکن اولوالعزمی میں وہ اقبال سے ضرور آگے نکل گئے ہیں، پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ اقبال نے جس خیال کا صرف شاعرانہ اظہار کیا تھا وہ محمد علی کے عمل کی جولان گاہ تھا۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"میں بھی ایک اونچے تیرتھ کی تلاش میں احرام سفر باندھ چکا ہوں۔ اور یقیناً دنیا کے تیرتھوں سے میرا تیرتھ بھی اونچا ہے۔ اس کا کلس دامانِ آسمان سے ملا ہوا نہیں ہے بلکہ اونچے سے اونچے آسمان سے بھی زیادہ بلندی پر وہ عرش و کرسی بچھی ہوئی ہے جس پر میرے دیوتا کی وہ مورتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکے نہ چھو سکے اور پھر بھی خود میری شہ رگ سے وہ قریب تر ہے۔ لیکن اس کا تو مجھے کبھی بھی شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اقبال کا اونچا تیرتھ فقط شملہ کی بلندی تک اونچا ہے[1]

آخری جملہ محمد علی کے "حسن استدلال" کی مثال کے طور پر نقل کر دیا گیا۔ ورنہ اقبال کے سیاسی رویے یا کسی خاص عمل یا کسی خاص گرد و پیش میں محمد علی کے کسی بیان کو اقبال کے قوم پرستانہ جذبات کو پرکھنے کے لیے کسوٹی نہیں بنانا چاہیے۔

اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کے بارے میں ہمیں محمد علی کے افکار اور ان کے تبصرے سے بالکل آگاہی نہیں ہو سکی۔ یوں بھی اقبال کی شاعری کا یہ دور نہ صرف مختصر ہے بلکہ اس زمانے میں جب کہ یورپ میں بسلسلۂ تعلیم ان کا قیام تھا، انہوں نے بہت کم کہا ہے۔ البتہ تیسرے دور کی شاعری کے بارے میں خاصے تفصیلی خیالات اور

---

[1] ایضاً ص ۴

بعض نظموں پر ان کے طویل تبصرے ہمارے سامنے ہیں۔ اس دور کے بارے میں محمد علی لکھتے ہیں :

"آخری دَور کا آغاز "بلاد اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے مگر اس طرح آتا ہے کہ ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ — دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام — ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے، نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں — صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں"[۱]

یہ مقام یعنی تیسرے دَور کا آغاز محمد علی کے نزدیک "حقیقت کی طرف اقبال کے جلد جلد ترقی کرنے کا تھا"۔ اس کے بعد محمد علی لکھتے ہیں :

"اقبال جب حقیقت کی طرف جلد جلد ترقی کر رہے تھے۔ اس کے بعد "گورستانِ شاہی" پر جو نظم لکھی گئی۔ اس میں البتہ چند شعر ایسے ہیں کہ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اب بھی بعض اوقات چیزوں پر سطحی نظر ڈال رہا ہے ؎

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ یک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے"[۲]

محمد علی نے "گورستان شاہی" پر بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بعض بڑے بلیغ نکتے بیان کیے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کا یہ پورا تبصرہ درمیان میں مصنف کی مداخلت کے بغیر پڑھا جائے اوپر کے شعر کے بعد محمد علی لکھتے ہیں :

"اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ اقبال بھی ان تاریخوں کے مؤلفوں کی طرح جو اسکولوں

۱؎ طبیبِ حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۴) روزنامہ ہمدرد دہلی ۱۹، اگست ۱۹۲۷ء ص ۳

۲؎ ایضاً

کی خواندگی میں داخل کی جاتی ہیں اقوام کو بادشاہوں سے ممیّز نہ کر سکے۔ وہ خود پوچھتے ہیں کہ :

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اور خوب کہتے ہیں کہ ؎

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور یہ بھی صحیح فرماتے ہیں کہ ؎

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

لیکن اگر مسلمان بھی ایک "قوم" ہیں اور کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسلام پر قائم رہیں تو پھر یہ ہرگز صحیح نہیں کہ ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاج ور

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ! اسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا آسماں سے ابرِ آزاری اٹھا، برسا، گیا

اگر یہ صحیح ہے تو صرف اس معنی میں کہ خدا نئی نئی قوموں کو مسلمان کرتا رہے گا اور انہیں کے ذریعے سے ابد تک اسلام کو قایم رکھے گا۔

افسوس کہ اقبال بھی نفس پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے کو "عہدِ رفتہ" سمجھے اور انہوں نے فرمایا کہ ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

ہاں! اس امت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے۔ انہیں نے حضرت معاویہؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحید الدین کے زمانے تک اپنی ذات اور خاندان

کے مفادات کو امّت محمدیہؐ اور ملت اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی اور ہم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اقبال اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے مگر بحمداللہ جنگ عموی تک اس پر آ پڑے، اور خدا ضرور ان کو ان حقیقتوں کے آشکار کرنے کی جزائے خیر دے گا"[1]

اس کے بعد محمد علی نے رموزِ بے خودی کے باب یعنی "حریت اسلامیہ اور سرِّ حادثۂ کربلا" سے ستائیس منتخب اشعار نقل کیے ہیں، اور یہ اشعار نقل کرنے کے بعد ان پر ایک جملہ میں تبصرہ کیا ہے کہ:

"اس سے زیادہ بادشاہت کی مذمت اور کیا ہو سکتی ہے"[2]

اس جملے میں نہ صرف فکر اقبال کا نچوڑ آگیا ہے بلکہ محمد علی نے اِس پر اپنی پسندیدگی کی مہر بھی لگا دی ہے۔

یہاں پر محمد علی نے اقبال کے عمل کی پستی اور افکار کی بلندی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کا تعلق چونکہ اس وقت کے حالات سے تھا اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ انداز فکر درست نہیں کہ ایک شخص جو بنیادی طور پر شاعر، فلسفی اور مفکر ہے، اس سے میدانِ عمل کا شہسوار اور صاحب عزم امور بننے کی توقع کی جائے۔ اس اصول میں اگرچہ ہمارے استاد مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، انہوں نے یہ بات غالب کے دفاع میں کہی ہے۔ لیکن یہ موقع ایسا ہے کہ محمد علی کے قول ہی سے استدلال کیا جانا چاہیے۔ مولوی عبدالرحمٰن ندوی نگرامی نے مولانا محمد علی سے گزارش کی کہ "ہم طلبۂ ندوہ تو یہ چاہتے ہیں کہ "تنہائی کی راتوں" میں "خلوت کی ملاقاتیں" جو آپ کے نصیب میں آئی ہیں۔ ان سے ہمیں بھی مستفید فرمایا جاوے" محمد علی نے اس گزارش کے جواب میں فرمایا:

"میرے عزیز بھائی! تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے۔ شاعر تو اپنی خیالی دنیا میں کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اُس سے اُن چیزوں کا ثبوت عملی دنیا

---

[1] ایضاً ص ۳

[2] ایضاً ص ۳

میں طلب کرنا تو بڑی زیادتی ہے۔"[1]

اگرچہ اسلام کے نزدیک فکر و عمل کا یہ تضاد پسندیدہ نہیں لیکن نغمہ و شعر اور اقدام و سعی کے میدان ہمیشہ الگ الگ ہی رہے اور اگرچہ دنیا نے یہی کہا اور یہی پسند کیا کہ ع

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

لیکن ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ طاؤس و رباب کی صدائے دل نواز اور سیمیں بدن حسیناؤں کے پہلو سے اٹھ کر کسی نے شمشیر و سناں کو بوسہ دیا ہو، اور میدانِ جہاد اور ابتلا و آزمائش کی صحرانوردی کے لیے احرام سفر باندھا ہو۔ پھر اگر صدیوں کی مسلمانوں کی تاریخ یہ رہی ہو تو اقبال ہی کو کیوں نشانۂ ملامت بنایا جائے۔ اقبال شاعر تھے اور ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان کے افکار سے ہم اپنی زندگی کے دروبست کی زینت میں کیا اور کس حد تک کام لے سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہ اقبال عمل کے مرد میدان نہیں تھے، محمد علی کے مقابلے میں ان کے فکر و عمل میں نہ تو یمین و یسار کا تذبذب نظر آتا ہے اور نہ صبح و شام کے تغیرات اور انتہا پسندی۔ اقبال کے فکر و عمل کی کسی خامی کو تسلیم کر لینے میں ایک لمحے کے بھی میری عقیدت مانع نہیں ہو سکتی لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے یہاں محمد علی سے زیادہ فکر میں پختگی، مزاج میں اعتدال اور عمل میں سلامت روی ہے۔ بہرحال یہاں اقبال کے بارے میں محمد علی کے افکار زیر بحث ہیں اور مجھے اس نقطے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ محمد علی لکھتے ہیں:

"کاش آج بھی اقبال کو کربلا کی فتح نمایاں اسی طرح یاد ہوتی .. "گورستان شاہی" میں انھوں نے مسلم[2] کو بھی یزید کی طرح رخصت کر دیا۔ لیکن "رموز

---

[1] عبدالماجد دریابادی، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۴ء حصہ اول ص ۱۳۸۔

[2] یہاں محمد علی کو لفظ مسلم سے ایک دلچسپ التباس ہوا۔ انہوں نے اسے صحابی رسول حضرت مسلمؓ سمجھ لیا اور پھر ابتدائی سطروں میں مسلم کے تعلق سے یزید کا نام بھی بڑھا دیا۔ اور "مضامین محمد علی" (حصہ دوم) کے مرتب یا کاتب نے "مسلم" پر رضی اللہ عنہ کے نشان رضؓ کا اضافہ کر دیا۔ حالانکہ یہاں مسلم سے مسلم قوم مراد ہے نہ کہ حضرت مسلمؓ اقبال نے مصر، بابل، ایران، یونان، روما کے زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر کہا ہے:

آہ مسلم بھی زمانے سے یوں ہی رخصت ہوا — آسمان سے ابر آزاری اٹھا، برسا، گیا

بے خودی" ہیں وہ صحیح راستے پر آپڑے، اور انھوں نے خوب فرمایا"[1]
اس کے بعد محمد علی نے

در بہاراں جوشِ بلبل دیدۂ رستخیز غنچہ و گل دیدۂ

سے لے کر

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستاں میرد اگر میریم ما

تک پینتیس[۳۵] شعر نقل کیے ہیں[2]۔

"گورستان شاہی" کے بعض خیالات سے اختلاف کے بعد "رموزِ بے خودی" کے افکار کو محمد علی نے اقبال کا "صحیح راستے پر آپڑنا" قرار دیا ہے اور جو اشعار اوپر نقل ہوئے ہیں ان کی داد "انھوں (اقبال) نے کیا خوب فرمایا" کہہ کر دی ہے۔ آخر میں ان الفاظ میں ان پر تبصرہ بھی کیا ہے:

"تعجب ہے کہ جو شخص جانتا تھا کہ شوکت شام و فرِ بغداد و سطوت غرناطہ میں اسلام کی حقیقت نہ تھی بلکہ اس کی حقیقت تھی تو مدینہ منوّرہ میں اور کربلائے معلیٰ میں تھی۔ جو شخص جانتا تھا کہ بغداد پر وہ کچھ گزرا جو روما پر نہ گزرا، پھر بھی تاتاریوں کے اٹھائے ہوئے محشر کا یہی نتیجہ نکلا کہ ہلاکو ہی کی قوم نہ صرف مسلمان ہوئی بلکہ اس نے از سرِ نو یورپ میں داخل ہو کر اس کی زمین میں پھر اسلام کا جھنڈا گاڑا، اور ہلاکو کی تباہ کی ہوئی خلافت کو پھر زندہ کیا اور چار سو برس تک زندہ رکھا۔ جو شخص جانتا تھا کہ رومیوں کی گرم بازاری اور ان کی جہانگیری اور جہاں داری آج باقی نہیں، ساسانیوں کا شیشہ چکنا چور ہو گیا، خم خانۂ یونان کی رونق نہ رہی اور مصر بھی فراعنہ کی ہڈیوں کی طرح اہرام کے تلے دب گیا۔ مگر بانگِ اذاں جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی، آج بھی ہے اور ملت اسلامیان اگر نہ رہے گی تو دنیا بھی نہ رہے گی کیوں کہ ع

---

[1] طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ (۴) روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء ص ۳

[2] ایضاً ص ۴-۳

گلستاں میرد اگر میریم ما

وہ بادشاہوں کے اجڑے ہوئے گورستان کو دیکھ کر یہ کس طرح کہہ سکا کہ ؎

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا　　آسماں سے ابر آزاری اُٹھا، برسا، گیا

یقیناً اس وقت تک اقبال پر حقیقت کا پورا پورا انکشاف نہ ہوا تھا۔ مگر یہ ظلم ہوگا کہ میں اس کو ظاہر کر دوں کہ اس نظم (گورستان شاہی) کے آخر میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ؎

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم　　آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں　　برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیٔ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ　　خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور　　ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور!

تاہم میرے نزدیک جو کچھ اسلامی بادشاہوں نے دکھایا وہ اکثر اسلام کی شان جلالی کا بھی ظہور نہ تھا۔ وہ شانِ جلالی جو ہر زبردست زیردست کو دکھا سکتا ہے اسلام کی شان جلالی نہیں۔ اسلام کی شانِ جلالی کو تو صرف وہ دکھا سکتا ہے جو اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکے اور جو ابھی اسلام کی شانِ جمالی دکھا سکتا ہے وہ یقیناً اس کی شان جلالی بھی دنیا کو ایک بار دکھا دے گا۔[1]

"گورستان شاہی" جس پر محمد علی کا مفصل تبصرہ گزشتہ صفحات میں آپ کی نظر سے گزرا، اقبال کی ۱۹۱۰ء کی نظم ہے۔ اس کے بعد دو اہم نظمیں شکوہ و جواب شکوہ ہیں جو ایک ہی سلسلے کی بظاہر الگ لیکن دراصل متصل کڑیاں ہیں۔ زمانی لحاظ سے بھی کوئی بُعد نہ تھا "شکوہ" ۱۹۱۱ء کی اور جواب شکوہ ۱۹۱۳ء کی نظم ہے۔ اگرچہ واعظوں اور خطیبوں نے ان نظموں سے ہمیشہ گرمیٔ محفل کا کام لیا ہے اور ان کے افکار تازہ و بلند سے اپنے وعظ و خطابت کی تیغ کو سان پر چڑھایا ہے لیکن اہل علم نے سنجیدہ و علمی مقالات میں اس سے اعتنا نہیں کیا۔ محمد علی نے نہایت سنجیدہ اور علمی مقالات میں اس کے اشعار نقل کیے ہیں۔ کامریڈ کے ایسے

---

[1] ایضاً ص ۴

مقالات میں جن کے مخاطب عام پڑھے لکھے لوگ نہ تھے بلکہ ایک خاص سطح کے اہل علم خصوصاً انگریزی داں اور حکومت کے اعلیٰ حلقوں کے لوگ تھے، ان کے اشعار سے استدلال کیا ہے ۱۱ جولائی ۱۹۱۴ء کے لیڈنگ آرٹیکل میں "جواب شکوہ" کا یہ بند نقل کیا ہے۔

جا کے مسجد میں جو ہوتے ہیں صف آرا تو غریب[1] — زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے[2]

محمد علی کے نزدیک "جواب شکوہ" اسلامی افکار کے لحاظ سے اسرار خودی اور رموز بے خودی کے پایے کی یا اسی سلسلۂ افکار کی نظم ہے۔ انہوں نے جس سیاق سباق میں اسے پیش کیا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ہمدرد کے مقالہ افتتاحیہ مورخہ ۱۲۔ اگست ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں:

"جب کہ ہم لوگ ..... پوری جدوجہد کر کے انگریزوں سے سوراج لینے کے لیے بے تاب و بے قرار تھے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' کا مصنف اور ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کا نسخہ! یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز شے تھی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنے کسی مریض سے کہتے کہ جاؤ ٹونا چماری سے جھاڑ پھونک کرالو، اس طرح بچ سکتے ہو ورنہ بس اب

---

[1] بانگ درا میں اس مصرع کی نشست الفاظ اس طرح ہے:
جائے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
لیکن محمد علی کے پیش نظر اس نظم کا شاید وہ نسخہ ہوگا جو ۱۹۱۳ء میں موچی دروازے کے جلسے میں اقبال خود چھپوا کر لائے تھے یہ نظم اس زمانے میں بعض رسائل و اخبارات میں بھی چھپی ہوگی۔ ممکن ہے محمد علی کی نظر سے کوئی رسالہ یا اخبار ہی گزرا ہو اور اس میں یہ مصرع اسی طرح ہو۔ اقبال نے نظر ثانی میں اس کے بعض بند قلم زد کر دیے تھے، بعض میں لفظی تبدیلیاں کر دی تھیں اور بعض بندوں کی ترتیب بھی بدل دی تھی۔

[2] ڈیر یلیکٹ پلگرمس ایٹ جدہ، کامریڈ، دہلی ۱۱ جولائی ۱۹۱۴ء ص ۲۸

تمہارا خاتمہ ہے"[1]

اسی سلسلۂ مقالات میں ۱۲ر اگست کو مقالہ افتتاحیہ میں قرآن کی آیت "لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ..... الآیہ

اور اس کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"یہ سبق ہم نے قرآن کریم سے حاصل کیا ہے اس کی تفسیر ہمارے لئے کسی مولوی نے نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر اقبال نے کی تھی۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا انھوں نے ہمیں نہیں سکھایا تھا کہ

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا"[2]

اس کے بعد پھر "حرف ایراد" ان کی زبان قلم پر آگیا ہے۔ لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد علی کی نظر 'جواب شکوہ' کے تمام خصائص و محاسن اور اس کے افکار کی رفعتوں پر تھی۔

سلسلۂ اقبالیات کی آخری قسط میں انھوں "شمع و شاعر" کے مکالمے کے بیشتر اشعار نقل کر دیے ہیں۔ ان کا انداز بیان یہ ہے کہ کیا آپ نے یہ نہیں کہا، اور کیا آپ کا یہ شعر نہیں ہے، کیا آپ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی تھی ؟ وغیرہ اس سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری پر محمد علی کی نظر تھی لیکن اس کے بارے میں محمد علی کی کسی رائے، فکر یا تشریح و تعبیر کا کوئی خاص پہلو سامنے نہیں آتا۔ البتہ آخر میں صرف اتنی بات قابل توجہ ہے کہ وہ اقبال کو اپنے افکار کا عملی نمونہ بن جانے کی دعوت دیتے ہیں :

"میں تو آج بھی اقبال اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ، ساقیا! تو آتش بجام آ کر تو دیکھ، کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں، تو بادِ بہاری کا پیام تو بھیج، یہ خزاں دیدہ چمن پھر ایک بار اپنی بہار دکھا دے گا، مانا کہ آخرِ شب بسمل کی

---

[1] میرا استاد اقبال۔ روزانہ ہمدرد، دہلی، ۱۲ر اگست ۱۹۲۷ء ص ۴۔

[2] "شمع و شاعر" کے مصنف سے ایک سوال (مقالہ) مضامین محمد علی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۴۰ء حصہ دوم، ص ۱۷۴۔

تڑپ دید کے قابل تھی مگر تو بالائے بام آکر تو دیکھ ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لیے بہت بسمل باقی ہیں، ابھی تک شعلہ نہیں بجھا ہے مگر وہ سودائی کہاں ہے جو سوزِ تمام کا سودائی ہو، پھول ہرگز بے پروا نہیں تو گرم نوا تو ہو، یقیناً کارواں گم کردہ راہ ہے اور کارواں والے اس قدر نیند کے ماتے ہیں کہ اس خارزار میں پڑے سو رہے ہیں لیکن آوازِ درا بھی تو آج کسی کو سنائی نہیں پڑتی، کیا تو نے ہی ہمیں عرفی کا یہ شعر یاد نہیں دلایا تھا کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی — حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

کیا آج بھی عرفی کی تربت سے یہی صدا نکل رہی ہے کہ

’شکوۂ اہلِ جہاں کم گو‘

بس یا تو خاموش رہ یا پھر وہی راگ الاپ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ۱۹۲۲ء تک دیپک کا کام دیا تھا، اور ہر قلب میں ایک آگ سی لگا دی تھی مگر شرط خود تیری اپنی مقرر کردہ ہے ؎

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غیرتِ گر باطل بھی تو

.... کیا تو ہی وہ اقبال نہیں جس نے ہم کو بتایا تھا کہ ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبی تعلیم لَاتَحْزَنْ بگیر
قوتِ ایماں حیات افزایدت — وردِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلبِ او از لَاتَخَفْ محکم بود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است
بیم چوں بند است اندر پائے ما — ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

”شمع وشاعر“ کا ایک اور بھی حوالہ محمد علی نے دیا ہے اور جس موقع پر اور جس سیاق

۱؎ ایضاً ص ۷۵-۲،۷،۴

دیباق میں انہوں نے "شمع" کا بیان نقل کیا ہے۔ اس سے اس نظم میں نئے معنی اور نئے مفہوم نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سیاسی فکر کی پختگی کے کس مقام پر تھے اور بدیشی حکومت کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے، اور یہاں کے باشندوں یا اس کشتِ زارِ ہند کے دہقان سے کیا توقع رکھتے تھے؟ محمد علی لکھتے ہیں:

"تیس کروڑ خدا کی مخلوق یعنی نسل انسانی کا ایک خمس مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے۔ جو سات ہزار میل کے فاصلے سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے اور پانچ براعظموں کے تماشائی دور دور مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دِلّی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں لیکن آج یہ مخلوق خود دوسروں کی تماشائی ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے؟
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں بھی کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اسی دانے کو، اسی کھیتی کو، اسی باراں کو، اسی حاصل کو، اسی راہ کو، رہرو کو، رہبر کو، منزل کو، اسی ناخدا کو، بحر کو، کشتی کو، ساحل کو، اسی قیس کو، لیلےٰ کو، صحرا کو، محمل کو، اسی مے کو، مینا کو، ساقی کو، محفل کو آوارہ عناں تاب رائے سینا کی سڑکوں پر دیکھا کہ داخلے کے ٹکٹ ہاتھ میں لیے ہوئے جارہی ہے گویا وہ بھی کسی تاریخی خاندان کا شجرہ یا جنت کے لیے پروانۂ راہ داری ہے۔ منزل مقصود پر پہنچے تو گویا اپنا دل بھی یہی کہتا تھا کہ ؎

یاں قافلہ لٹتا ہے بس یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ[۵۲]
(جوہر)

محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد کے پچاسوں مقالوں میں اقبال کے سیکڑوں اشعار پیش کیے ہیں اور اس طرح اپنے قارئین کے لیے مطالعے کی دلچسپی کا سروسامان فراہم کیا ہے۔ ان مقالات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علی اقبال کے گرویدہ تھے، ان کے کلام کے شاعرانہ محاسن اور اس سے بڑھ کر اقبال کی اسلامی فکر کے اندازہ شناس بھی تھے اور قدردان بھی۔ سیاسی مسائل میں اگرچہ متعدد بار اقبال سے شدید اختلاف کیا لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت اور ان کا اسلامی فکری مقام کبھی معرض بحث میں نہیں آیا بلکہ وہ "اقبال کی جگہ ان کے پچھلے کلام کے دلدادہ" پھر بھی رہے۔ حتیٰ کہ اقبال کے عمل اور سیاسی رویے پر خود ان کے اشعار سے استدلال کیا، اور اس بات کو انہوں نے اختلاف کے عالم جوش میں بھی نظر انداز نہیں کیا کہ اقبال سیاست داں کے علاوہ شاعر و فلسفی بھی ہے اور جیسے کہ ان کی زندگی کے بعض اعمال وقتی اور گردوپیش کی سیاست اور مصالح سے متاثر ہوئے ویسے ان کے افکار پر حالات و مصالح کی پرچھائیں بہت کم پڑی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ہمدرد کے ایک افتتاحی مقالے میں یہ چند جملے کیا ہی خوب ہیں:

"اقبال کے ہم نوا تو آج ہزاروں ہیں، اگر ان کی جگہ میں ان کے پچھلے کلام کا دلدادہ، ان کا کلام آج دہراؤں تو نامناسب نہ ہوگا۔"

اس کے بعد محمد علی نے اسرار خودی کی آخری نظم "دعا" سے بارہ شعر نقل کیے ہیں محمد علی کا یہ مقالہ "دہلی میں سیاسی فرقوں کا شوریٰ" کے عنوان سے تھا اور موضوع اور محل کی مناسب سے یہ اشعار کیا ہی خوب ہیں:

من کہ بہر دیگراں سوزم چو شمع — بزم خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فرداستم — در میانِ انجمن تنہاستم
در جہاں یارب ندیم من کجاست — نخل سینا یم کلیم من کجاست
ظالم بر خود ستمہا کردہ ام — شعلۂ را در بغل پروردہ ام
شعلۂ غارت گرِ سامانِ ہوش — آتشے افگندہ در دامانِ ہوش
عقل را دیوانگی آموختہ — علم را سامانِ ہستی سوختہ

شمع را سوزِ عیاں آموختم — خود نہاں از چشمِ عالم سوختم
شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید — از رگِ اندیشہ ام آتش چکید
سینۂ عصرِ من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غم گسارے تا کجا — جستجوئے رازدارے تا کجا

من مثالِ لالۂ صحرا ستم
درمیانِ محفلِ تنہا ستم"

۱۹۲۸ء کے ایک اور مقالے میں جو انہوں نے "دیسی ریاستیں اور ان کی اصلاح کی تجاویز" کے عنوان سے لکھا تھا۔ مطلق العنانی کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واقعہ کربلا کی حقیقت سے استدلال کیا ہے۔ لیکن یہ استدلال بھی اقبال کے توسط سے ہے۔ چونکہ آج تمام دنیا میں حریت اور حقیقی جمہوریت کے قیام و بقا کا مسئلہ، اہم ترین مسئلہ ہے، اس لیے اسلام کے ان دونوں عزیزوں کے فکر انگیز اور سبق آموز خیالات کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں[1]:

"لکھوکھا مسلمانوں نے بھی اب تک واقعہ کربلا کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور آج تک نہ جانا کہ امام حسینؓ کا یزید کو بہ حیثیت حضرت معاویہؓ کے وارث کے خلیفہ تسلیم نہ کرنا دراصل خلافت راشدہ کے احیاء کی کوشش تھی تاہم حقیقت یہی تھی۔ اور یہ اسی کی بنا پر ہے کہ اقبال نے کہا ہے ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
بر زمین کربلا بارید و رفت — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

---

[1] دہلی میں سیاسی فرقوں کا شوریٰ۔ روزانہ ہمدرد دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۲۸ء، ص ۳

"خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد — ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید — از رگِ اربابِ باطل خوں کشید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت — سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسین آموختیم — ز آتشِ او شعلہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز"[1]

اب میں ایک اقتباس پیش کروں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ اگرچہ سیاست کی دنیا میں محمد علی نے اقبال کا اثر قبول نہیں بلکہ ان کی مخالفت کی اور طنز و تشنیع کا کوئی موقع انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا لیکن ان کے افکار و احساسات پر پنجاب کے اسی منکسر المزاج، شرمیلے اور عزلت گزیں بیرسٹر کا قبضہ و تسلط تھا۔ اسی کے کلام نے ان کے فکر کی رہنمائی کی، اور اسی کا کلام ان کے قلب کی بے چینیوں کے لیے وجہِ تسکین ثابت ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی لندن جاتے ہوئے جزیرہ مالٹا کے ساحل پر اترے اور اس ویران و تقریباً غیر آباد جزیرہ میں دنیا کی ہلاکت کے سر و سامان دیکھے تو بے اختیار ہو گئے اس موقع پر انھیں اقبال کے چند اشعار بار بار یاد آتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مالٹا تقریباً ویران سا اور غیر آباد جزیرہ ہے لیکن اربوں بلکہ کھربوں روپیہ اس پر صرف کیا جا چکا ہے اور ایک ایک جہاز کروڑوں کی لاگت کا وہاں لنگر انداز ہے۔ توپیں بھی ہیں اور فوج بھی اور طیارے بھی، پانی میں سرنگیں بھی ضرور لگی ہوں گی۔ زرہ بکتر سے بھی قلعہ محفوظ ہوگا۔ مال و زر، محنت، دماغی قابلیت اور ہر طرح کی قربانیاں کون سی چیز ہے جو اس ویران جزیرہ پر قربان نہیں کی جا چکی؟ لیکن کس لیے؟ نہ اس لیے کہ انسانوں کو زندہ رکھا جائے یا ان کی مادی یا روحانی اصلاح کی جائے بلکہ صرف اس لیے کہ انسانوں کو انسان زیادہ تیزی

---

[1] دیسی ریاستیں اور ان کی اصلاح کی تجاویز۔ روزنامہ ہمدرد دہلی، ۲۵ فروری ۱۹۲۸ء ص ۲-۳

کے ساتھ ہلاک کر سکے۔ سائنس کے تازہ سے تازہ انکشافات اسی ایک مہلک مقصد کی نذر ہوتے رہتے ہیں اور اسی کا نام تہذیب اور امن ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا میرے دل پر کتنا اثر ہوا، اور نہ صرف دو گھنٹے ہم نے مالٹا کے ساحل پر گزارے بلکہ وہ سارا دن اور دراصل کم سے کم مارسیلز پہنچنے تک سارا وقت اسی غور و فکر میں گزرا کہ کیا اسی کا نام ارتقا ہے اور کیا ساری دنیا کو ایسی تہذیب کی تقلید کرنی ہوگی؟ اس کے بعد بار بار اقبال کے وہ شعر یاد آتے تھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کُن
خیز و قانونِ اخوت سازدہ — جامِ صہبائے محبت بازدہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی
ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر — چوں بہاراں بر ریاضِ ما گزر
سجدہ ہائے طفلک و برناؤ پیر — از جبینِ شرمسار ما بگیر

از وجودِ تو سرافرازیم ما
پس بہ سوزِ ایں جہاں سوزیم ما

دیکھیے سبل السلام تک دنیا کب اور کس طرح پہنچتی ہے۔[1]

محمد علی نے اقبال کے کلام کو اپنے افکار کی تائید میں اور خیالات کو موثر بنانے کے لیے صرف نقل ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کے اسلوب پر بھی اقبال کے کلام کا اثر پڑا ہے۔ انھوں نے اکثر موقعوں پر اقبال کے الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارات وغیرہ استعمال کیے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نثر میں سادگی کے ساتھ رنگینی اور دل فریبی پیدا ہو

---

[1] محمد سرور، پروفیسر (مرتب) مولانا محمد علی یورپ کے سفر، لاہور، کتاب خانہ پنجاب، ۱۹۴۱ء، ص ۹۹، ۹۸

گئی ہے - ۱۹۱۵ء میں علامہ اقبال نے ایک نظم لکھی تھی جو "عرفی" کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہے لیکن پہلے پہل یہ نظم مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار "البلاغ" کلکتہ میں شائع ہوئی تھی - اور الہلال والبلاغ کی روایت میں یہ امتیاز صرف اقبال کو حاصل ہوا کہ ان کی نظم نے سرورق کے صفحہ اول پر جگہ پائی[1] اس نظم میں ذوقِ نغمہ کی کم یابی اور محمل کی گرانی کے عالم میں نوا کو تلخ اور حدی کو تیز کرنے کی دعوت دی گئی تھی - اقبال کی یہ ایک نہایت دل آویز نظم ہے، اور اس میں عرفی کے ایک شعر کی تضمین کی گئی ہے :

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

محمد علی نے ایک جگہ اس شعر کو اپنی تحریر میں استعمال کیا ہے[2] اور ایک مقالے میں انھوں نے اس نظم کے تین شعر استعمال کیے ہیں لیکن خاص چیز جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہ اولاً تو یہ ہے کہ انھوں نے اس نظم کے اشعار کو ٹھیک اس موقع پر اور ایسے ہی حالات میں استعمال کیا ہے جیسے کہ ۱۹۱۵ء میں مسلمانوں کی غفلت، بے حسی اور ان کی بے عملی سے پیدا ہو گئے تھے، ثانیاً اس نظم کے الفاظ اور اس کی تراکیب سے انہوں نے اپنی نثر کو رنگین اور دیدہ زیب بنایا ہے - محمد علی لکھتے ہیں :

"جب ترک موالات کی آزمائش والے زمانے کے قاید قید خانوں سے نکلے تو انہوں نے اصلاح حال کی بہت کوشش کی مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا - ہر شخص لیڈر تھا - مقتداؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میسر آتے تھے - عوام پریشان تھے کہ کس کو رہنما سمجھیں - ایک ایک راستے پر لے جانا چاہتا ہے تو دوسرا دوسرے راستے پر اور ہر ایک رہنما دوسرے رہنما کو رہزن بنا رہا ہے - سب الگ الگ سُر الاپ رہے تھے، ذوقِ نغمہ کی شدت اور کثرت اب کہاں میسر آتی ؟ بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانے میں اپنی صداءِ بلند کو بلند تر کر دیا جن کی غرض نمائش تھی انہوں

---

[1] ہفتہ وار البلاغ - کلکتہ، ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء ص ۱ (سرورق)

[2] "شمع و شاعر" کے مصنف سے ایک سوال (مقالہ) مضامین محمد علی، محولہ بالا، ج ۲، ص ۴۷۵

نے اس غرض کو پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر خاموشی اختیار کی بعض نے اس چیخ و پکار میں اپنی صدا بلند کرنے کو از راہِ فرزانگی بے سود سمجھا اور اقبال کی طرح کہنا شروع کیا۔

مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آگیا ایسا — کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کو بارِ گوش ہوتی ہے — نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطف بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر — گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

مہاتما گاندھی تک خاموش ہو گئے، اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت بھی اختیار نہیں فرمایا بلکہ ایک نقارہ لے کر اسی نقار خانے کے نقار چی وہ بھی بن بیٹھے لیکن ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ سکوت اختیار کیا، نہ کوئی سُر الاپنا شروع کر دیا، اور سامعین کی قلت و بے پروائی کا مطلق پاس نہ کر کے ہم نے حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا کہ ؎

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس — در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے "ذوقِ نغمہ" میں کمی محسوس کر کے جس قدر "تلخ نوائی" کی اور محمل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز تر کیا، اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔[۱]

اوپر کی سطروں میں ذوقِ نغمہ، تلخ نوائی، محمل، گراں، حدی، تیز الفاظ اقبال کی نظم سے مستعار ہیں۔ اسی طرح ایک مضمون میں محمد علی لکھتے ہیں:

"میں تو آج بھی اقبال، اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا! تو آتش بجام آکر تو دیکھ، کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں۔ تو بادِ بہاری کا پیغام تو بھیج، یہ خزاں دیدہ چمن پھر ایک بار اپنی بہار دکھا دے گا۔ مانا کہ آخرِ شب بسمل کی تڑپ دید کے قابل تھی مگر تو پھر بالائے بام آکر تو دیکھ ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لیے بہت بسمل باقی ہیں۔ ابھی تک شعلہ نہیں بجھا ہے مگر وہ

---

[۱] فسانۂ غم دل (مقالہ) روزانہ ہمدرد دہلی، ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء ص ۳

سودائی کہاں ہے جو سوزِ تمام کا سودائی ہو، پھول ہر گز بے پروا نہیں تو گرم نوا تو ہو، یقیناً کارواں گم کردہ راہ ہے اور کارواں والے اس قدر نیند کے ماتے ہیں کہ اس خارزار میں پڑے سو رہے ہیں لیکن آوازِ درا بھی تو آج کسی کو سنائی نہیں پڑتی۔"[1]

ان سطروں میں ساقیا، آتش بجام، شعلہ آشام، بادِ بہاری کا پیام، آخرِ شب، بسمل کی تڑپ، دید کے قابل، بالائے بام، شعلہ کا بجھنا، سودائی، سوزِ تمام، پھول کا بے پروا ہونا گرم نوائی، کارواں کا گم کردہ راہ ہونا، آواز درا وغیرہ الفاظ و تراکیب، اقبال کے کلام سے مستعار اور "شمع و شاعر" کے چند اشعار سے مستفاد ہیں۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے — لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے — ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی — پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ — صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

ان مباحث و تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے کلام کو محمد علی نے نہ صرف اپنی اردو اور انگریزی کی تحریروں اور خطوط میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور اپنی نگارشات کی تزئین کا کام لیا ہے بلکہ کلام اقبال اور اس کے فکری و شعری محاسن نے محمد علی کے ذہن و فکر پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اور اس سے ان کے اسلوب کے حسن و جمال اور ان کی دل فریبیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

---

[1] شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال (مقالہ) مضامین محمد علی، محولہ بالا، ج ۲، ص ۴۷۴۔

میرا "استاد" اقبال

(۱)

جس زمانے میں میں نے کلکتے سے "کمریڈ" نکالنا شروع کیا تھا تو اس امید پر کہ ملک و ملت کی طرف سے ایک ایسے جریدے کی جو یورپ کے ہفتے وار جرایدکے انداز پر نکلا کرے گا کما حقہٗ قدر کی جائے گی۔ برطانیہ کے بہترین روزانہ اور ہفتے وار جرایداور ماہوار اور سہ ماہی رسائل کی ایک بڑی تعداد بہ صرف کثیر منگانا شروع کی تھی اور "کمریڈ" کی پرانی فائلوں کا کوئی آج بھی مطالعہ کرے تو دفتر میں ایک بڑا ذخیرہ اب تک پڑا ہے جسے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات وواقعات سے دلچسپی رکھنے والے تھوڑی ہی سی قیمت پر اب بھی منگا سکتے ہیں) تو اسے اس زمانے کے ہندوستان اور اسلامی ممالک کی ایک نہایت مفصل اور مکمل اور دلچسپ تاریخ "کمریڈ" کے صفحات میں مل جائے گی جس میں تقریباً وہ تمام چیزیں شامل ہوں گی جو ہندوستان اور اسلامی ممالک کے متعلق برطانوی جرایدورسائل میں شایع ہوا کرتی تھیں، لیکن "کمریڈ" کی یوں تو ہر طرف سے مانگ تھی مگر جب پیشگی چندہ نہیں آتا تھا اور وی۔پی بھیج کر بقایا وصول کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو وہی پرچے واپس کردیے جاتے تھے جو قیمت طلب روانہ کیے جاتے تھے لیکن اور پرچے جو ہفتے وار جاتے رہتے تھے، خوشی خوشی قبول کرلیے جاتے تھے اور بڑی دلچسپی اور نہایت شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء کے آخری ہفتے کے پرچے میں اس کی تفصیل وار شکایت کرکے میں نے دکھایا تھا کہ صرف اس سال کے دس ماہ میں بائیس ہزار کے وی۔پی واپس آئے تھے اور وصولیابی اور نادہندی کا تناسب روپے میں چھ آنے اور دس آنے تھا۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد اب ایک روزانہ انگریزی اخبار پھر نکالنا چاہتے ہیں مگر "آئی۔ڈی۔ٹی"

ماخذ: روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۲ر اگست ۱۹۲۷ء

کی طرح نہ صرف اپنے روپے سے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے روپے سے، خدا اسے
"آئی۔ ڈی۔ ٹی"[1] سے زیادہ کامیاب کرے مگر جو ذہنیت مسلمانوں کی آج ہے وہ ۱۹۱۱-۱۲ء
کی ذہنیت سے بھی کہیں بدتر ہے اور مجھے خوف ہے کہ شاید مہاراجہ صاحب کو بھی روپے
میں چھ آنے سے زیادہ وصول نہ ہوں۔ خیر مہاراجہ صاحب غالب کی طرح فرما سکتے ہیں کہ
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
میری دعا ئے خیر ان کے ساتھ ہے۔ اگر ان کو کوہِ طور سے 'لن ترانی' کے سوا کوئی اور
جواب ملا تو پھر موسیٰ کی بھی امید از سرِ نو بندھ چلے گی۔ مجھے جو عرض کرنا تھا وہ یہ ہے کہ عام
مسلمانوں کی اس مفت خوری سے مجبور ہو کر اور خود مہاراجہ صاحب کی فیاضی پر حد
سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کے خیال سے میں "کمریڈ" کو بند کرنے کا اعلان کر ہی چکا تھا کہ
۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو جس دن برطانیہ نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا "کمریڈ" کی
ضمانت کی ضبطی کا حکم سر علی امام نے ٹیلیفون پر سنایا اور اس کے بعد ایک پرچہ اور نکلنے
کے بعد "کمریڈ" کی نشاۃِ اولیٰ کا خاتمہ ہوا۔ پورے دس برس بعد ۱۹۲۴ء کے اواخر میں ہمت کر
کے "کمریڈ" پھر نکالا اور اس بار پیشگی چندے کے بغیر اخبار کسی خریدار کے نام بھیجنے کا غلط
اصول ابتدا ہی سے بند کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نشاۃِ ثانیہ کی اشاعت نشاۃِ اولیٰ کی اشاعت
کے نصف سے کبھی نہ بڑھی مگر جو خریدار درج رجسٹر کیا گیا وہ اس بار حقیقتہً خریدار تھا۔
مفت خور نہ تھا۔ اس بار مصارف بھی بہت ہی کم رکھے گئے مگر جنگ کے بعد سے ہر
چیز کی قیمت اور راڈیٹروں کے سوا، ہر شخص کی اجرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس بار بھی
برابر خسارہ اٹھانا پڑا اور دو دو اخبار ایک ہی شخص کے نکالنے کے باعث صحت الگ
رخصت ہوئی اور "کمریڈ" کی نشاۃِ ثانیہ کا بھی خاتمہ کر کے میں نے اپنی نشاۃِ اولیٰ کے خاتمے
کو بفضلہٖ بچا لیا۔ اس دورِ ثانی میں اتنی ہمت کس طرح کر سکتا تھا کہ برطانیہ کے اکثر بڑے
جرائد اور رسائل منگاتا لیکن ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے واقعے کے سلسلے میں ولایت

---

[1] آئی ڈی ٹی سے مراد لکھنو کا روزنامہ "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف" ہے کامریڈ دہلی کے بند ہو جانے کے بعد راجہ غلام حسین اس سے منسلک ہو گئے تھے (۱۶-۵-۱۹۱۵ء) اس کے بعد راجہ صاحب محمود آباد نے راجہ غلام حسین کی ادارت میں ہفتہ وار نیو ایرا، لکھنو سے نکالا۔ اس کا پہلا پرچہ ۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو نکلا۔ راجہ غلام حسین کے حادثۂ انتقال (۲۵ اگست ۱۹۱۷ء) کے کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں راجہ صاحب نے پھر کوئی اخبار نکالنے کا عزم کیا تھا۔ (ابو سلمان شاہجہانپوری)

جانا پڑا تھا تو پریس کٹنگ ایجنسیوں سے واسطہ پڑا تھا اور ان کا خاصہ تجربہ حاصل ہوا تھا اور ۱۹۳۰ء میں بھی جب وفدِ خلافت کی سرکردگی کرنے کے لیے پھر ولایت جانا پڑا تو پھر ایک ایسی ہی ایجنسی سے واسطہ پڑا اور مقابلۃً تھوڑے ہی صرف سے برطانیہ کے جرائد و رسائل کے سینکڑوں اقتباسات وصول ہوتے رہے۔ جب ۱۹۲۴ء میں "کمریڈ" پھر نکالا تو زیادہ تر انھیں اقتباسات پر انحصار کیا اور جنھوں نے خاص دور کا "کمریڈ" پڑھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ مشکل ہی سے ایسا کوئی مسئلہ تھا جس کا تعلق ہندوستان یا اسلامی ممالک سے ہو اور "کمریڈ" نے برطانوی جرائد و رسائل کے اقتباسات کے ذریعے سے اس پر کافی روشنی نہ ڈالی ہو۔

یہ طول طویل تمہید صرف اس لیے لکھی گئی کہ قارئین کرام کو یقین دلایا جائے کہ ہندوستان میں بہت ہی کم ایسے جریدہ نگار ہوں گے جو مجھ سے زیادہ برطانوی پریس سے واقف ہوں۔ ان کے متعلق میرے کم سے کم پندرہ بیس برس کے تجربے نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ "نیوز پیپر" (ہرگز نہیں ہوتے، روزانہ جرائد بھی ہفتے وار جرائد کی طرح حقیقۃً "ویوز پیپر" (ہوتے ہیں اور جو "نیوز" یعنی خبریں بھی ان "اخباروں" میں شایع ہوتی رہتی ہیں وہ بھی دراصل مالکوں اور اڈیٹروں کی "ویوز" یا آرا ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہی خبریں ان اخبارات میں شایع کی جاتی ہیں جن کا اخبار میں طبقے پر وہی اثر پڑے جو اخبارات کے مالک اور اڈیٹر اس پر ڈالنا چاہتے ہیں الا ماشاء اللہ اور جن واقعات کی اطلاع کا اخبار میں طبقے پر ان کے نزدیک بُرا اثر پڑے گا ان کو درج اخبار ہی نہیں کیا جاتا اور کتمانِ حق ہی پر اکتفا نہیں ہوتا بلکہ تلبیس الحق بالباطل بھی برابر جاری رہتی ہے اور زیادہ تر اسی کے ذریعے سے اخبار بین طبقے کی رہنمائی کی جاتی رہتی ہے بالفاظ دیگر اخبارات ایک خبر رساں ایجنسی ہرگز نہیں، سب کے سب پروپیگنڈے کی ایجنسی ہیں۔

اس ہفتے کی ولایتی ڈاک مجھے ہفتے کی شب کو ملی۔ دن بھر کام کر کے تھک گیا تھا۔ سونے کو لیٹا تو سرہانے ڈاک رکھی ہوئی تھی۔ ایک روزانہ اخبار کے اڈیٹر کی زندگی باوجود

ہزار اوّ علائے آزادی کے ایک غلام کی زندگی ہے۔ اسی وقت آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور جو اقتباسات برطانوی اخبارات کے آئے تھے ان کو ترتیب دی۔ ایک ماہوار رسالے میں "سردار" اقبال علی شاہ صاحب برطانوی جاسوس کا ایک طویل مضمون سال گذشتہ کی مومنر پر پھر ملا اور وہی محمد علی کے متعلق گالی گفتاری پڑھنے میں آئی۔ بظاہر انڈیا اوفس اور فارین اوفس (دفتر خارجہ) کو سلطان ابن سعود کے متعلق ساری دنیا کے خیالات کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے کہ ایک سال ہو چکا اب تک وہی "سردار" اقبال علی شاہ "نمایندۂ مشرق" کی دروغ بافیاں جاری ہیں اس کے بعد ایک اقتباس پر نظر پڑی جس کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ بقول اخبار "سنڈے نیوز" پڈوکوٹہ کی ریاست میں اگر آج کچھ ہو رہا ہے تو یہی کہ سیکڑوں احتجاجی جلسے منعقد کیے جا رہے ہیں جن میں موجودہ "ایجنسی" کو جاری رکھنے کے لیے بیتابانہ اظہار کیا جا رہا ہے اور اس اندیشے سے سب کا کلیجہ بظاہر منہ کو آ رہا ہے کہ کہیں "گوری رانی کا بیٹا" یعنی ان مہاراجہ پڈوکوٹہ کا بیٹا جنھوں نے ایک نہایت حسین آسٹریلین عورت سے شادی کر لی تھی اور گوری قوم کی اس طرح "توہین" کرنے کی پاداش میں جلاوطن ہو کر ولایت میں سوکھ رہے ہیں کہیں ان کے بعد تخت نشین نہ ہو جائے اور ان کا بھائی جو بطور "ایجنٹ" کے ان کی جگہ حکومت کر رہا ہے ان کی وراثت سے محروم نہ ہو جائے۔

ان خبروں کے علاوہ ہندوستان کے چھوٹے سے چھوٹے فساد کی خبریں تھیں اور اخبارات کے "گٹنگز" کیا تھے ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں تھیں جو اڑائی گئی تھیں۔ انھیں میں اچھوت قوموں کے متعلق بھی ایک طول طویل "ٹائمز" کا مضمون تھا اور کون ہندوستانی ہے جو کہہ سکتا ہے کہ انگریزوں کو حق حاصل نہیں ہے کہ ہماری انوکھی "قومیت" کی اس طرح دھجیاں اڑائیں جب کہ ہر جگہ فسادات ہو رہے ہیں اور پانچ چھ کروڑ انسانوں کو اسی "قوم" کے اعلیٰ ترین افراد کے نزدیک چھونا بھی حرام ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کا راستوں سے گذرنا بھی ممنوع ہے۔ دل دکھانے کے لیے یہی مواد کیا کم تھا کہ ۲۰ جولائی کے "ٹائمز" کا ایک طویل اقتباس یا دس بخیر "پنجاب کی بین الملل کشیدگی" "اصلاحات کا اثر" کی سرخیوں والا نظر پڑا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے مگر ولایتی اخبارات میں مہینے بھر میں مشکل سے دو چار

سطریں ہندوستان کے متعلق شایع ہوتی ہیں اور رائٹر تک اس سے زیادہ تار پر بھیجنے کو فضول خرچی سمجھتا ہے لیکن یہ طول طویل "خبر" جو باریک ٹائپ میں بھی مشکل سے ایک کالم میں سمائی، شملہ سے اسی دن تار پر بھیجی گئی جس دن کے "پرنٹنگ ہوس اسکوائر" میں طبع کی گئی اور یقیناً "ٹائمز" کے اپنے "نامہ نگار" نے انگلستان کے سب سے مہنگے اور سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ ضخیم اور سب سے زیادہ دروغ باف اخبار کا بہت سا روپیہ اس تار کے ارسال کرنے میں صرف کرادیا، تھکا تھکایا نیند سے مخمور "ہمدرد" کا غریب اڈیٹر مجبور ہو گیا کہ شملہ کی اس "خبر" کو پڑھے، پڑھا تو پنجاب کی کونسل کا وہ "مباحثہ" تھا جو مسٹر اوگلوی ڈپٹی کمشنر لاہور کے حکم امتناعی کے بعد ان کی قہرمانی کے آلہائے کار یعنی پولیس کے لیے ایک مزید منظوری پر اور اس کے بعد ایک سکھ رکن کی اس تحریک پر ہوا تھا کہ تمام عہدے کھلے ہوئے مقابلے کے ذریعے سے امیدواروں کو دیے جائیں یا ایسے انتخاب کے ذریعے سے جس میں "جات پات" مذہب اور رنگ کا کچھ لحاظ نہ رکھا جائے۔ میں نے "ہندوستان ٹائمز" میں اس "مباحثہ" کی رپورٹ پڑھی تھی اور یہ بھی پڑھا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تو غضب ہی کیا تھا کہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہندوستانیوں کی جگہ انگریزوں کو مقرر کیا جائے لیکن میں نے ان کی پوری تقریر کسی جگہ نہیں پڑھی تھی اور میرا گمان تھا کہ اس اخبار کے نامہ نگار نے غلط فہمی سے یہ قول ان سے منسوب کر دیا تھا۔ اس وقت بھی ان کی پوری تقریر میرے سامنے نہ تھی لیکن اس کے چند زہر آلود فقرے اس تار میں درج تھے۔ ان کے پڑھتے ہی میری نیند غائب ہو گئی اور میرے قلب کو اس قدر سخت دھچکا لگا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس وقت نظر بند نہیں ہوئے جب کہ جنگ عمومی میں ہم میں سے بہت سے نظر بند کر دیے گئے تھے، وہ اس جنگ کے بعد بھی مارشل لا کے زمانے میں قید نہیں ہوئے حالانکہ خود پنجاب میں بعض بڑے سے بڑے ہندو اور مسلمان قید کر دیے گئے اور عوام میں سے تو سینکڑوں ہی جیل خانوں میں بھر دیے گئے۔ خلافت کے لیے مسلمانان ہندوستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا جس کا سرکردہ میں تھا تو ڈاکٹر صاحب کو اس قدر غیرت آئی (اور میں اس غیرت کو بجا سمجھا تھا) کہ انھوں نے "دریوزۂ خلافت" نام کا قطعہ لکھا جس

میں ارشاد فرمایا کہ ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن جب "دریوزہ گرانِ خلافت" خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے مگر اس کا تہیہ کر کے، کہ یہ اتمام حجت تھا اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ اگر قوت نہ ہوگی تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا تک پسند کریں گے مگر یورپ کے آگے ہاتھ جوڑنا پسند نہ کریں گے اور اگر قوت ہوگی کھلا ہاتھ نہ بڑھے گا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائے گا تو مہاتما گاندھی نے ترک تعاون کی تحریک شروع کر دی تھی اور خلافت اور پنجاب کے مظالم ہی اس تحریک کی بنا تھے۔ الحمد للہ کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ کے طلباء نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا اور اس امید پر کہ جس صوبے کے اسلامیہ کالج نے اسلام کے عشق میں ۱۴ طلباء[1] سرحد پار بھیج دیے تھے وہ اس میں مطلق تامل نہ کرے گا۔

---

[1] ان طلبہ کے نام یہ ہیں۔ ان کی درسگاہوں اور جن درجوں میں زیر تعلیم تھے نیز جن شہروں سے تعلق رکھتے تھے، ان تمام امور کی صراحت کر دی ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام طلبہ اسلامیہ کالج سے تعلق نہ رکھتے تھے۔

۱۔ گورنمنٹ کالج، لاہور۔ اللہ نواز خاں بی اے (ملتان) غلام حسین بی اے (لاہور) شیخ عبداللہ بی اے (وزیر آباد) عبدالباری ایم اے (لاہور) شیخ عبدالقادر ایم اے (لاہور) عبدالمجید خاں بی اے (میانوالی) ظفر حسن بی اے (کرنال) قاضی عبدالرشید بی اے (دہلی)

۲۔ اسلامیہ کالج، لاہور، محمد حسن عرف محمد یعقوب بی اے (سیالکوٹ)

۳۔ میڈیکل کالج، لاہور خوشی محمد عرف محمد علی سال دوم (سیالکوٹ) رحمت علی عرف زکریا سال دوم (لاہور) شجاع اللہ سال دوم (لاہور) عبدالحمید سال دوم (لاہور)

۴۔ چیفس کالج، لاہور، عبدالخالق بی اے (لاہور)

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اسی سے اندازہ کیا کہ طلباء کس قدر مستعد ہوں گے مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سکریٹری تھے اور آپ نے جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا (نہ کہ کسی مولوی سے) ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے علمائے کرام کا فتویٰ لے لیا جائے۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتویٰ صادر فرما دیا مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی البتہ اجتہاد فرمایا تو علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے اس وقت جب کہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کر لائے اور وہ اجتہاد یہ تھا کہ اس سے ایک ٹیکنولا جیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے جو ہندوستانیوں کو ٹھیک اس وقت صنعت و حرفت سکھانا شروع کرے جب کہ ہم لوگ چھ مہینے اور پوری جد و جہد کر کے انگریزوں سے سوراج لینے کے لیے بیتاب و بیقرار تھے۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ"، "اسرار خودی"، اور "رموز بے خودی" کا مصنف اور ٹیکنولا جیکل انسٹی ٹیوٹ کا نسخہ یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز شے تھی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنے کسی مریض سے کہتے کہ "جاؤ، نونا چماری سے جھاڑ پھونک کرا لو اس طرح نہ بچ سکتے ہو ورنہ بس اب تمہارا خاتمہ ہے"۔ اس کے بعد پھر

یہ وہ چودہ طلبہ ہیں جن کی طرف متن کے بیان میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اللہ نواز کا بھائی شاہ نواز خاں، ان کے باپ خان بہادر رب نواز خاں کا پروردہ عبدالحق اور شیخ عبداللہ کا بھائی عبدالرحمٰن بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ شاہ نواز اور عبدالرحمٰن بھی طالب علم تھے۔ عبدالرحمٰن اس قافلۂ مہاجرین کی روانگی کے چند دن بعد روانہ ہو کر مجاہدین کے مرکز اسمس میں جماعت مہاجرین سے جا ملا تھا۔ عبدالحق وہی شخص ہے جو افغانستان سے مولانا عبیداللہ سندھی کے خطوط لے کر سندھ آیا تھا اور ملتان کے دورانِ قیام میں خان بہادر رب نواز خاں نے اس کی ناپختہ کاری اور کمزور طبیعت سے فائدہ اٹھایا، راز اگلوا لیا اور خطوط حاصل کر کے برٹش حکومت کے حوالے کر دیے خود تو غداری کے صلے میں مربعے حاصل کر لیے اور سرفروشان کو قید اور دار و رسن کی آزمائش کے حوالے کر دیا۔ تاریخ آزادی پاک و ہند میں یہ خطوط ریشمی خطوط یا ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہیں ان خطوط میں ملک کی آزادی کے لیے ایک انقلابی منصوبہ درج تھا۔ گورنمنٹ نے اسے ریشمی رومال شازش کیس کا نام دیا۔ (ابو سلمان شاہ جہان پوری)

پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور اگر اس سے پہلے حسرت کا قول صحیح نہ تھا تو اب ضرور صحیح ہو گیا کہ ع

آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں

مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کے نسخے والے طبیبِ حاذق انار کلی میں بیٹھے "پیام مشرق" لکھتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بیجا پور کے جیل خانے میں "اسرار و رموز" پڑھا کرتا تھا اور رو دیا کرتا تھا اور "اقبال مرحوم" کے لیے اسی کے الفاظ میں دعا کیا کرتا تھا کہ جس کا ایمان اس قدر صحیح اور پختہ ہے، یا رسول اللہ خداوند کریم سے سفارش فرمایئے کہ اس کو عملِ صالح کی بھی توفیق عطا فرمائے ؎

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است | یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عز و جل | عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ | بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا | آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

ڈاکٹر اقبال صاحب کو میں "اقبال مرحوم" اسی زمانے سے کہنے لگا اور انھیں میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے سیکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے جب کہ کبھی بیجا پور کے جیل خانے میں زبان پر بھی آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا جو کسی ایسے خاندان والوں کے قلب پر ہوتا جن کی ایک چہیتی لڑکی کسی شرمناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکا یک ان کی نظر اس پر پڑ جائے، محبت اور شرم دونوں کی کشمکش کا اس سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کونسی جنگ ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی میں جو کچھ اپنے استاد شاعری کے نہیں مذہب اسلام کے استاد "اقبال مرحوم" کے متعلق لکھ رہا ہوں میرا دل ان کی محبت کے باعث تڑپ رہا ہے اور میرا دماغ میرے قلم کی مہمیز اور چابک دونوں سے تواضع کر رہا ہے کہ اگر قدم ذرا بھی سست پڑا تو کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ حق پرستی کے میدان میں قدم

کا ذرا بھی سست پڑنا الٹے پاؤں باطل کی طرف لے جانے سے کچھ ہی کم گناہ ہے۔
کاش اقبال ہمارا محبوب و معشوق اقبال، ہم کو اس دور ارزاد میں اسلام کی صراط مستقیم دکھانے والا اقبال، ہماری ہی طرح کسی جیل خانے میں ہوتا۔ کیا ہمارے بیتول جیل سے نکل کر سیدھے امرت سر کی کانگریس میں آکر شریک ہونے پر اقبال ہی نے یہ اشعار نہیں لکھے تھے ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت، مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

بیتول کی قید کے زمانے میں تو پھر بھی صرف چند ہی مسلمان اور ہندوستانی اس سعادت سے مشرف کیے گئے تھے لیکن کراچی کے مقدمے کے بعد تو بیس تیس ہزار اس سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے اور غالباً زاغ و زغن تک کا شہپر اس وقت قید و صید کے بند میں گرفتار تھا لیکن اقبال اس وقت بھی آزاد ہی رہے اور "الم تر انہم فی کل وادٍ یہیمون" کے مصداق رہے
اس بار جو ہم جیل خانے سے چھوٹے تو "اقبال مرحوم" ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔
اس کے بعد کس نظم کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی اور ان کے لیے سوائے دام اقبالہم کے کس چیز کی دعا کی جا سکتی تھی۔ بقول انھیں کے اب تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ ؎

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست | اعتبارِ ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بت خانہ دوخت | مفتیِ دینِ متیں فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما | رُخ سوئے مے خانہ دارد پیرِ ما

آج بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور عبدالرحمٰن غازی جیل میں سڑ رہے ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ آزاد ہیں، اور اقبال کی دعا قبول ہو کر ان کو جو "ہمدمِ دیرینہ" اور ان کے "عشقِ عالم سوز" کا "آئینہ" ان کا "یار ہمدم" اور ان کے "رموزِ فطرت" کا محرم سے

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ — از خیال این وآں بیگانۂ

ملا ہے وہ محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق ساگر چند) ہیں اور ان کی پرانی خواہش کہ سے

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشکِ گلِ خود پیکرش — ہم صنم او را شوم ہم آذرش

پوری ہو گئی اور دونوں مل کر اس ہائے وہو میں مصروف ہیں کہ سب عہدے خالی کراؤ اور سب کے سب انگریزوں کو دو۔[1]

ان شاء اللہ کل ان کی تقریر کے وہ جملے نذرِ قارئینِ "ہمدرد" کروں گا جو قارئینِ "لندن ٹائمز" ہو چکے ہیں اور ان خیالات کا بھی ترجمہ کیا جائے گا جن کا ان جملوں کو سننے کے بعد "ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے اظہار فرمایا ہے اور پھر کچھ "شمع و شاعر" کے منظوم مکالمے میں سے بھی نذرِ قارئینِ کرام کیا جائے گا جس کو اسی آج کے انگریز پرست نہ سہی انگریز پرور شاعر نے اپنے پچھلے جنم میں تصنیف کیا تھا اور ہم کو قید و بند کیا' جان لینے اور دینے تک پر مستعد کر دیا تھا۔ قارئینِ کرام انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں۔

---

[1] جو ہندو اور مسلمان اس مطالبے میں علامہ مرحوم کے ہم خیال تھے یا جن کے علامہ مرحوم ہم رائے تھے، ان میں پنجاب قانون ساز کونسل کے نامور رکن محمد امین بھی شامل تھے۔ (ابو سلمان شاہجہانپوری)

طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ

(۲)

"ہمدرد" مورخہ ۱۴ر اگست میں میں نے "لندن ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار کے اس طول طویل تار کا ذکر کیا تھا جو اس نے پنجاب کونسل کے مباحثے کے متعلق ۱۹ر جولائی کو روانہ کیا تھا جس میں سر محمد اقبال صاحب کے وہ زہریلے فقرے جو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں قوم پر دروں پر کسے تھے، پہلی بار میری نظر سے گذرے۔ حسبِ وعدہ آج میں ان فقروں کو جو ۲۰ر جولائی کو نذرِ قارئین "لندن ٹائمز" ہو چکے ہیں نذرِ قارئینِ "ہمدرد" بھی کرتا ہوں اور نیز ان خیالات کو جن کا ان فقروں پر "ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے اظہار فرمایا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کل اور آج جو پنجاب کونسل کے اجلاس ہوتے ان میں جو موضوع سب سے زیادہ ممتاز تھا وہ پنجاب میں مختلف ملتوں میں پھیلے ہوئے بغض و عناد کا مسئلہ تھا۔ غیر سرکاری تقریروں کا عام مفہوم اس امر کا ایک کھلا ہوا اعتراف تھا کہ یہ مرض جمہوریت کے اس اصول کا نتیجہ ہے جو "اصلاحات" میں مدِ نظر رکھا گیا تھا اور نیز اس کی گہری اہمیت کا۔ اور حال میں۔ جو سخت شور مچایا گیا ہے کہ عہدے ہندوستانیوں کو دیے جائیں اور اس کے خلاف دور دور تک جو ردِ عمل رونما ہو رہا ہے اس کا ایک ایسا اقبال تھا جسے ہمت والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ جن بزرگ کے یہ الفاظ ہیں وہی آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں کہ خلافت پارٹی میں جو انتہا پسند حصہ ہے اس کے دو مسلمان ارکان نے اس پر احتجاج کے طور پر کہ بہ قول ان کے حال کے فساداتِ لاہور میں پولیس نے چند مسلمانوں کو مارا پیٹا تھا پولیس کے محکمے کے لیے ایک چھوٹی سی مزید منظوری کی کل مخالفت کی تھی، اس پر جو بحث چھڑ گئی اس میں نہایت نازک صورت حالات کے ہوتے ہوئے پولیس کے عمدہ طرزِ عمل پر اسے عام طور سے خراجِ تحسین دیا گیا۔ ان دونوں شخصوں نے جو انتظامِ سرکار سے سخت بے زار

ماخذ: روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۶ر اگست ۱۹۲۷ء

تھے تقسیم آراء کا مطالبہ کیا مگر کسی نے ان کی تائید نہ کی اور صاحبِ صدر نے جو سرکار کے نامزد کردہ نہیں ہیں بلکہ منتخب شدہ رکن کونسل ہیں ان کے اس مطالبے کو لغو و بے معنیٰ قرار دیا۔ اس کے بعد یہ بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک سکھ رکن نے آج ایک تحریک پیش کی جس میں اس کی سفارش کی گئی تھی کہ گورنمنٹ کے تمام عہدے جہاں تک ممکن ہو ایک کھلے مقابلے کے ذریعے سے پُر کیے جائیں یا ایک ایسے انتخاب کے ذریعے سے جس میں "جات پات" اور مذہب و رنگ کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ اس تحریک نے ایک عام بدگمانی کو مشتعل کر دیا جو نہ صرف مسلمانوں کی طرف سے تیز دماغ ہندوؤں کے خلاف ظاہر ہونے لگی بلکہ ہندو مزارعین کی طرف سے بھی ان ہندوؤں کے خلاف جو شہروں میں سکونت پذیر ہیں۔

خیر یہ تو سب کچھ تھا ہی لیکن اب سر محمد اقبال دام اقبال لہم کا ذکر آتا ہے تار کے اس حصے کی سرخی "جھوٹی قوم پروری" ہے اور نامہ نگار موصوف اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل ذکر بیان ڈاکٹر سر محمد اقبال کا تھا جو ایک ممتاز آگے کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور معتدل خیالات کے مسلمان ہیں اور ایک ایسے شاعر ہیں کہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہے دہائے کوئی ہم سے پوچھے کہ ہم انھیں کیسا شاعر سمجھتے ہیں اور کس قدر تعجب کرتے ہیں کہ ان کا شہرہ ساری دنیا میں بھی اس قدر کیوں نہ ہوا جس قدر کہ ہندوستان میں اور بالخصوص مسلمانوں میں گھر گھر ہے۔) نامہ نگار رقمطراز ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ارشاد فرمایا کہ لاہور کے حال ہی کے فسادات کے بعد مسلمانوں نے ایک وفد ڈپٹی کمشنر کے پاس جو ضلع کا مجسٹریٹ ہے اس غرض سے بھجوایا کہ پولیس جن ہندوؤں سے تفتیش کرا رہی تھی اُن کے خلاف مسلمانوں کی بے اعتمادی کا اظہار کیا جائے اور ہندوؤں نے بھی ایسا ہی وفد مسلمان تفتیش کنندگان کے خلاف بے اعتمادی کے اظہار کے لیے بھجوایا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں بھی مسلمانوں کے وفد کے ساتھ گیا تھا۔ مجسٹریٹ نے جواب میں فرمایا کہ "اصلاحات سے پہلے ۱۲۰ برطانوی افسر تھے جن کی خدمات سے ایسے کاموں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، اب صرف ۶۸ ہیں۔ تم دونوں یورپین افسروں

کو ملنگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمھاری درخواست پوری کرنے کے لیے کافی یورپین افسر نہیں ہیں۔

نہیں معلوم کہ مسٹر اوگلوی کے اس جواب کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کے وفود نے کیا کہا لیکن ہمیں یقیناً اس کی آرزو ہے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب بتا دیں کہ خود انھوں نے کیا فرمایا۔ "ٹائمز" کا نامہ نگار اس پر مطلق روشنی نہیں ڈالتا اور بظاہر اس کا بھی امکان ہے کہ مسٹر اوگلوی کا فقرہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس قدر لاجواب ہو کہ وہ خاموش اور لاجواب ہو کر واپس تشریف لے گئے ہوں۔ اس کے بعد نامہ نگار لکھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بعض عہدے جو پہلے برطانوی "جنٹلمینوں" کو ملتے تھے وہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے حصے میں آ گئے لیکن گورنمنٹ نے جس وقت یہ تبدیلی کی اس نے ایک بڑی غلطی کی اور وہ مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کریں گے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ اس پر قہقہوں اور تحسین کی آوازیں آنے لگیں اور ان کے خلاف چند آوازیں "نہیں" "نہیں" "نہیں" کی بھی آئیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے چلا کر ارشاد فرمایا کہ میں اس رائے کا اظہار اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھ بوجھ کر کرتا ہوں اور میں ان "نہیں" "نہیں" کی آوازوں کی حقیقت کو بھی خوب سمجھتا ہوں۔ یہ ایک جھوٹی قوم پروری کی نمایندگی کرتی ہیں۔ قوم پروری کا نام تو فیشن کے طور پر اس ملک کے لوگوں کی زبان پر چند برسوں سے ہے لیکن وہ اس کڑک مرغی کی ککڑوں کوں ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہو۔ نامہ نگار موصوف بھلا کیوں نہ کہے گا کہ اس پر خوب قہقہے پڑے اور عام طور پر تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں اس کے بعد وہ رقم طراز ہے کہ اس مباحثے میں متعدد نظیریں مختلف ملتوں کے درمیان اس بے اعتمادی کی ملیں جو اندر ہی اندر عجیب، لطیف اور باریک طریقے پر کام کر رہی ہے۔ یہ ظاہر کیا گیا کہ لاہور یونیورسٹی کے طالب علموں کے امتحانات میں جوابوں کی کاپیوں پر مصنوعی نام اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ ممتحنوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ اگر حقیقی نام لکھے جائیں تو وہ تعصب مذہبی کا ثبوت نہ دیں گے اور جب اس کا مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری نوکریاں دینے کا کام ایک ایسے پبلک سروس کمیشن کے سپرد کر دیا جائے جو خاص اسی کام کے لیے بنایا جائے تو عام

طور پر یہ آواز بلند کی گئی کہ "پھر تو اس کے ارکان کو یورپین ہی ہونا چاہیے بشرطیکہ اس سے انصاف کرانا ہو" اس کے بعد نامہ نگار صاحب کیوں نہ رقمطراز ہوں کہ بالآخر محرک نے التجا کی کہ تحریک کو واپس لینے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ ساری فضا پر ملت پرستی کی روح چھائی ہوئی ہے۔

اس ساری داستان کا لبِ لباب، جو جناب نامہ نگار صاحب نے نکالا ہے یہ ہے کہ "اصلاحات" اور ہندوستانیوں کو عہدے دیے جانے کے مطالبے کے خلاف جس ردِ عمل کا کونسل میں انکشاف ہوا ہے اُسے پنجاب کی (یعنی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ طبقے) کا عام جذبہ اور ان کے جی کی بات خیال کرنا چاہیے۔ آج بعض اوقات جو شعلے چمک گئے وہ اس دبی ہوئی سخت حرارت کی علامت تھے جو مباحثے کی تہ میں تھی، گو تقریروں کے درمیان میں بار بار ہنسی مذاق ہوتا رہتا تھا اور قہقہے بھی اڑتے رہتے تھے اور جو اثر ایک سننے والے کے دل پر اس سے پیدا ہوتا تھا وہ یہی تھا کہ عام طور پر اس سے ایک طرح کی خلاصی محسوس ہو رہی تھی کہ مختلف ملتوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا مردہ الماری میں سے گھسیٹ کر آخر کار باہر نکال کر ڈال دیا گیا ہے اور بحمد اللہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ سرگرم سیاسیین اسے چھپائے رکھنے کی کوشش جاری رکھیں۔ تاہم گذشتہ تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس ردِ عمل کے تقاضے پر اگر "اصلاحات" کی اصلاح کے لیے کوئی فوری کارروائی کی گئی تو قوم پروری میں پھر جان پڑ جائے گی اور جو لوگ حالات کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں ان کا خیال ہے۔ کہ اس مرض کے جو اسباب ہیں انھیں اب سے بھی زیادہ خراب نتائج پیدا کرنے پڑیں گے تب کہیں جا کر مؤثر تدابیر علاج کے لیے کام میں لائی جائیں گی تب تک یہ ہو۔ موجودہ صورت۔ حالات کا سب سے زیادہ خطرناک رخ یہ ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلم کشیدگی اب مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان تلخی کی شکل میں مبدّل ہو رہی ہے اور بغض و عناد کے شعلے اب پھیلتے پھیلتے شہروں سے گانوؤں تک میں پہنچ رہے ہیں۔

میرے مسلمان اور ہندو بھائی آج اس سارے تار کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور غور سے پڑھیں اور اس کا اصلی مطلب سمجھنے کی کوشش کریں کل انشاء اللہ میں بھی اس کے متعلق اپنے

ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا اور پھر بتاؤں گا کہ "شمع و شاعر" کا مصنف کس طرح "لندن ٹائمز" اور اس کے موکلوں کا آلہ کار بن رہا ہے۔ آج طبیب حاذق ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے صرف اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی اس تار کو پڑھ کر غور فرمالیں کہ جھوٹی قوم پروری کا الزام تو ہمارے سر آنکھوں پر مگر کیا خود ان کی وہ ملت پروری اس سے بہت زیادہ سچی نکلی جس کی ککڑوں کوں خود ان کے دوست آنریبل چودھری شہاب الدین صاحب جو پنجابی زبان میں اشعار آبدار بھی لکھا کرتے ہیں (گو ان کا مضمون ناک سنکنے اور ایسے ہی لطیف موضوعوں تک محدود رہتا ہے "شمع و شاعر" اور "شکوہ" و "جوابِ شکوہ" تک نہیں جاتا) اسی کونسل کی کرسیِ صدارت سے سنایا کرتے ہیں؟ ہم چودھری افضل حق صاحب اور ڈاکٹر محمد عالم صاحب ہی کی قوم پروری کا رونا رویا کرتے تھے مگر جب ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کی بھی ملت پروری کی "تہمت" اور "تمام شد" یہ ہے کہ چند اور مسٹر اوگلوی پنجاب کو دے دیے جائیں تو آج ہی تمام خرابیاں دور ہوئی جاتی ہیں، تو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ بہتر ہو کہ سارے ہندوستان کو تو مطلوبہ سوراج دے دیا جائے مگر ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالہم کے پنجاب کے لیے سر مائیکل اوڈوائر اور کرنل فرنیک جانسن اور کرنل ادبرائن اور مسٹر باسورتھ اسمتھ کو پھر اس پر حکومت کرنے کے لیے بلایا جائے اور اگر ممکن ہو تو جنرل ڈایر کو جلد جنت نصیب کرادی جائے جو یقیناً ان کے نزدیک ان کے زیر سایہ پنجاب پر مارشل لا کا نفاذ ہوگا۔

"شاعرِ وطن" اِقبال

(۳)

کل کے "ہمدرد" میں قارئین کرام نے وہ پورا تار پڑھ لیا ہو گا جو "لندن ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے پنجاب کونسل کے دو مباحثوں کے متعلق بصرفِ کثیر ارسال کیا تھا اور جس کا سب سے زیادہ "قابل ذکر" حصہ وہ تھا جس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ہماری بھولی قوم پروری کو کڑک مرغی کی ککڑوں کوں کا لقب عطا فرمایا۔ آج کون نہیں جانتا کہ ہندوستانیوں کو چند سال سے یہ امید دلا کر اُلّو بنایا جا رہا ہے کہ اب ایک نیا کمیشن آئے گا اور "اصلاحات" کی توسیع کرے گا۔ اور دو ڈھائی برس سے تو یہی ہوتا رہا ہے کہ ہم تاریخ کے غلام نہیں ہیں سنہ ۱۹۲۹ء سے پہلے بھی کمیشن بھیجا جا سکتا ہے لیکن یہی کہتے کہتے اتنے برس اور گذار دیے گئے اور اب کمیشن سنہ ۱۹۲۹ء سے پہلے مقرر بھی کیا جائے گا تو صرف اس لیے کہ اول تو "ٹوڈی" یا قدامت پسند پارٹی کو اپنی حیات مستعار کا بھروسہ نہیں رہا پچھلے پانچ ہنگامی انتخابات میں لبرل اور لیبر دونوں پارٹیوں کو ٹوڈی پارٹی سے زیادہ ووٹ ملے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء کے عام انتخابات میں اس پارٹی کو شاید شکست ہو جائے گی اور عنانِ حکومت لیبر یا لبرل پارٹی یا ان دونوں کی مشترکہ حکومت کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور دس برس کے لیے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کوئی اور حکومت کرے گی، نہ کہ یہ جو آزادی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ دوسرے، کمیشن کے اس وقت مقرر کیے جانے کا، جب کہ ہندو، مسلمان (اور اب تو سکھ بھی) بظاہر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں یہی نتیجہ ہو گا کہ ہندوستانی قوم کسی مطالبے پر بھی اتفاق نہ کر سکے گی، پنڈت مالوی اور ڈاکٹر منجے ایک چیز مانگیں گے تو سر محمد شفیع اور سر عبدالرحیم دوسری۔ اس لیے انگریز کسی کی بات بھی نہ مانیں گے اور وہی کریں گے جو خود ان کو مطلوب ہے، تو سنہ ۱۹۱۹ء کی طرح کوئی بھی مخالفت نہ کرے گا۔ ہندو اور مسلمان دونوں

ماخذہ روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۷ر اگست سنہ ۱۹۲۷ء

اسی میں مگن رہیں گے کہ خیر، ہمیں کچھ نہ ملا تو کیا ہوا، دوسروں کو بھی تو کچھ نہیں ملا ہے

شادم کہ بر رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشتِ خاکِ ماہم بر باد گشتہ باشد

ہندوستان کی موجودہ فضا سے فائدہ اٹھا کر اب "لندن ٹائمز" کا نامہ نگار جسے حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ دونوں کا ترجمان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے، اس مضمون کے تار شملہ سے ارسال کر رہا ہے کہ ۱۹۲۹ء میں جو "اصلاحات" منظور کی جائیں وہ ہرگز ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی توسیع نہ کریں بلکہ ۱۹۱۹ء کی "اصلاحات" کی بھی "اصلاح" ہی کر دیں، یعنی ان "اصلاحات" کی بھی تخفیف ہی کر دی جائے اور جو کچھ برائے نام "اختیارات" ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں کو عطا ہوئے تھے وہ بھی واپس لے لیے جائیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے باغی "بابوؤں" نے شور مچا کر "ملکی" مناصب کا ایک بڑا حصہ دھروا لیا تھا، ہر صوبے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانی داخل ہو گئے، مرکزی حکومت کی ایگزیکٹو کونسل میں داخل ہو گئے وزارتیں بھی انھوں نے حاصل کر لیں اور انگریز استادوں کا سب سے لائق شاگرد سنہا، جسے سب سے اول کلکتہ ہائی کورٹ کا ایڈووکیٹ جنرل بنایا گیا، پھر جسے سب سے اول حکومتِ ہند میں جگہ دی گئی پھر جسے مہاراجہ بیکانیر اور لارڈ مسٹن کے ساتھ جنگ کے زمانے میں خود برطانیہ کی وزارت میں خاص جگہ دی گئی، پھر ایوانِ امرا کا رکن، لارڈ اور نائب وزیر ہند بنایا گیا اور جو بالآخر بہار کے صوبے کی گورنری تک لے مرا۔ اس کے بعد تو فوج کے وفاداری بھی، جو فرانس میں صاحب لوگوں کو اپنی آنکھوں سے بھاگتا دیکھ چکے تھے اور خود سینہ سپر ہوئے تھے اور جن کی عادتیں یورپ کی زمین پر قدم دھرتے ہی مارسلیز کی میموں نے بگاڑنا شروع کر دی تھیں، پیرس، لندن اور برائٹین کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ بھی کچھ کلبلائے اور یہ دیکھ کر "ملکی" "بابوؤں" نے اور بھی شور مچایا اور اسکین کمیٹی بنی، اور جمعداری کے "کمیشن" کو ناکافی سمجھ کر اب تو لفٹنٹی اور کپتانی، میجری اور وکرنیلی، بلکہ "جرنیلی" تک کے کمیشنوں کا مطالبہ کرنے لگے اور ہندوستان ہی میں سینڈ ہرسٹ کی طرح کا فوجی اسکول کھولنے پر اڑ گئے۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی ہے اگر اس پر عمل بھی کیا گیا تو کئی نسلوں بعد ہندوستان کی حفاظت وہ ہندوستانی کرنے لگیں گے جو ہندوستان

تو ہندوستان برطانیہ اور فرانس کی بھی حفاظت بارہ برس ہوئے کہ جاکر کر آئے لیکن یہ بھی صاحب لوگوں کو گوارا نہیں اور "ٹائمز" کے شلوی نامہ نگار صاحب، اور وہ بڑی ہستیاں اور جماعتیں جن کی طرف سے وہ پروپگنڈا کر رہے ہیں اس اصول پر کاربند ہوتے ہوئے کہ "برگش بگیر تا بہ تب راضی شود" یہ ارقام فرمانے میں مصروف و مشغول ہیں کہ ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں پر اعتماد ہی کہاں ہے، وہ تو صاحب لوگوں ہی پر اعتماد کرتے ہیں، انھیں تو انگریز حکام درکار ہیں، فوج کے کمیشن ہندو مسلمانوں کو دینا تو درکنار جو "ملکی" مناصب بھی انھیں گزشتہ بیس سال میں دیے گئے وہ بھی ایک حماقت تھی، اور "اصلاحات" کی یقیناً ضرورت ہے لیکن وہی "اصلاحات" "اصلاحات" ہیں جو گزشتہ "اصلاحات" کی اصلاح کریں اور جمہوریت کا جو غیر موزوں عنصر گزشتہ "اصلاحات" کا جزو بنا دیا گیا تھا وہ تو ہندوستان کے لیے سمِ قاتل ہے۔ یہ مغرب کا بیج ہے اسے وہاں سے لاکر مشرق کی زمین میں بونا سخت حماقت تھی، نہ یہاں کی دھوپ اسے موافق، نہ یہاں کی گرم ہوا، نہ یہاں کی سوکھی ہوئی زمین۔ یہاں تو انگریز کلکٹر کی مطلق العنانی ہی موزوں ہے۔ یہ ضلع کا [illegible] (مغل اعظم) ہی فسادات کو روک سکتا ہے اور امن و امان کو قائم رکھ سکتا ہے۔ بس ہندوستانیوں کو تو کھیتی باڑی کر کے ہمیں اشیائے خام بھیجنے کی توفیق عطا کی گئی ہے، صنعت و حرفت ہمارا مشغلہ ہے، تجارت کا سلیقہ صرف ہم کو عطا ہوا ہے اور حکومت ہمارے ہی حصے میں آئی ہے۔

اس بیسویں صدی میں بھی اگر ہندوستانی اتنے مبتلائے توہم ہیں کہ ایک ان دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کا وجود بھی ان کے ذہن میں ہمارے حاکمِ ضلع کو دیکھ کر آیا ہے اور ہر ہندوستانی خدا کی حمد و ثنا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

اس کی قدرت کا بیاں کوئی کس طرح کرے
میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا

اس کے لیے مساوات وغیرہ کے خیالات سنکھیا کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مساوات جیسے الفاظ کا کچھ مفہوم وہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہتا ہے تو اپنے ملک کے ایک شاعر اکبر سے (جس نے ساری عمر ہماری خدمت کر کے ایک بڑا ملکی عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اسی کے ساتھ کچھ تجربہ اور سیاسی

احساس) اس سبق کو سیکھ لے کہ ؎

"برٹش رول" کو سب سے وہی بہتر سمجھا
جو ہر اک گورے کو لفٹننٹ گورنر سمجھا

شملہ اور لندن میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ پنجاب اور دوسرے ہندوستانی صوبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب خوب شعر کہا کرتے تھے اور غالبؔ کی طرح یہ کہہ کر کہ ؎

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

عدالتوں میں جا کر خاص وکالت بھی کر لیا کرتے تھے اور جو وقت بچتا تھا اس میں اسلامیہ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی بھی خدمت کر لیا کرتے تھے۔ اب نہ معلوم کیوں انھیں سوجھی کہ کونسل کو چلیے اور وہ پنجاب کی جمہور سے رائیں حاصل کرنے کے لیے در بدر پھرے اور اپنے مدِ مقابل کو بالآخر ہرا کر، ملک معظم اور ان کے ورثاء کی وفاداری کا حلف اٹھا کر پنجاب کونسل میں شریک ہوئے۔ ہمیں اسی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ خدا نے جس شخص کو "شمع و شاعر" اور "اسرار و رموز" کے لکھنے کی عجیب و غریب قدرت عطا فرمائی تھی وہ کہاں چودھری شہاب الدین کی زیرِ صدارت پنجاب کونسل میں بکواس کرنے جا رہا ہے۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ وہاں جا کر وہ محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق ساگر چند) کی طرح یہ مطالبہ کرے گا کہ جو چند بڑے عہدے اس وقت تک ہندوستانیوں کو دیے گئے ہیں وہ بھی ان سے چھین لیے جائیں اور انگریزوں کو دیے جائیں، اور بالخصوص جب کہ کم از کم پنجاب کے مسلم اخبارات اسے ان عہدوں میں سے ایک کے لیے امیدوار بنا رہے تھے۔

میں کل ہی کہہ چکا ہوں کہ ہماری قوم پر دری پر جھوٹے ہونے کا جو الزام انھوں نے لگایا ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر، یقیناً سیاسیین کی ایک بہت بڑی جماعت کی قوم پروری آج جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ہماری قوم پروری سچی ہوتی تو ملابار کے دردناک واقعات کے بعد نہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کو ہندو لیڈر اس طرح جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر شروع کرتے، نہ مسلمانوں میں لیڈری کے دعویدار اس اثر سے فائدہ اٹھا کر جو اس جذبۂ انتقام نے

عام مسلمانوں میں پیدا کیا تھا، تنظیم اور تبلیغ کا نام لیتے پھرتے سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہماری قوم پروری کے جھوٹے ہونے کی وہ کانگرسی ہندو ہیں جو آج مسلمانوں سے کھلم کھلا دشمنی رکھتے ہیں۔ الحمدللہ کہ ایک دو کے علاوہ اور وہ بھی پنجاب ہی میں، خلافت اور کانگرس والے مسلمان بہت سے کانگرسی ہندوؤں کے اس جذبۂ بغض و عناد سے اس طرح متاثر نہیں ہوئے کہ انھوں نے بھی اس جذبے کو اپنے دلوں میں جگہ دی ہو بلکہ وہ صراطِ مستقیم ہی پر قائم رہے، مگر ہندو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہیں ہی کتنے۔ باقی مسلمانوں سے صبر نہ ہو سکا اور لیڈری کے دعویداروں نے انھیں اس طرح گمراہ کر دیا[1] کہ اگر ابتدا ان کی طرف سے نہ ہوتی تو بعض اوقات جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر انتہا وہی کر دیا کرتے ہیں۔ یہ خود ڈاکٹر محمد اقبال صاحب لاہور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ٹھیک اسی شب کو جب کہ شواجی کی سہ صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی نہتے مسلمانوں پر حملہ کیا گیا اور ان کو شہید کیا گیا۔ جو سکھ اور ہندو اس ہولناک جرم میں شریک تھے وہ کسی سچی قوم پروری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود خود ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی پوری اور ان تھک کوشش کے ۳ مئی کی شب کے جرم کا جو انتقام ۴ مئی کی شب کو مسلمانوں نے لیا وہ بھی سچی قوم پروری کا مظاہرہ نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ افسوس ہے کہ پنجاب کے ہندو سکھ اور مسلمان اخبارات نے بھی جو تبصرہ ان ہولناک واقعات پر کیا وہ بھی سچی قوم پروری کی نمایندگی نہیں کرتا تھا۔ یہی حال اب پھر ملتان کے واقعات کے بعد رونما ہو رہا ہے اور ہماری جھوٹی قوم پروری کی نمائش کر رہا ہے۔

لیکن کیا ڈاکٹر صاحب سچی قوم پروری کو بھی پسند نہیں فرماتے؟ اگر وہ اپنے ابتدائی کلام پر غور فرمائیں گے تو انھیں خود اقبال کرنا پڑے گا کہ ان کے ابتدائی خیالات انھیں کے بعد کے اس سچے اصول کے کہ ع

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

کس قدر خلاف تھے۔ کیا انھیں نے یہ "ترانۂ ہندی" موزوں نہیں فرمایا تھا جس کا مطلع ہے کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

---

[1] ارشارہ تنظیم کے رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور تبلیغ کے داعی غلام بھیک تیرنگ کی طرف ہے جن سے مولانا محمد علی کے اختلاف اس زمانے میں پیدا ہو گئے تھے (ابوسلمان شاہجہانپوری)

میرے نزدیک تو باوجود میری اس قوم پروری کے بھی جسے اقبال صاحب جھوٹی قوم پروری کہیں گے ہندوستان سارے جہاں سے اچھا نہیں اور جو محبت میرے دل میں ہندوستان کی ہے وہ اسی جذبے کی بنا پر ہے کہ ؎

حبِّ وطن از ملک سلیماں خوش تر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوش تر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد
می گفت گدا بودنِ کنعاں خوش تر

خیر، اس بحث کو جانے دیجیے مگر اقبال صاحب یقیناً ایک زمانے میں تو قوم پروری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے "ترانۂ ہندی" تصنیف فرمایا اور اس کے ذریعے سے ہمیں یہ نہایت ہی صحیح تعلیم دی کہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی ترانے میں انھوں نے ہندوؤں کی بھی ترجمانی کر کے فرمایا ہے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

کم سے کم ایک مسلمان کی حیثیت سے تو مجھے افسوس ہے کہ یونان و مصر و روما کی طرح ہندوستان میں بھی بت پرستی اور اسی قسم کے توہمات کا خاتمہ نہیں ہوا اور زیس اور جوپیٹر، اپالو اور وینس، آئسس اور اسارس کی طرح ہندوستان کے بھی دیوتا اور دیویاں اپنے پوجنے والوں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو گئیں۔

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" باوجود اس مشتبہ شعر کے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا — میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے۔

"ترانۂ ہندی" سے میرے نزدیک صحیح ترخیالات کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن جب "نیا شوالہ" لکھنے کا وقت آتا ہے تو اقبال سچی قوم پروری کے ترجمان اور نمائندے بن کر کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آغیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اب میں اس بے مثل نظم کے لکھنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر میری طرح آج ان کا دل بھی ہندوستان کی جھوٹی قوم پروری پر رات دن روتا رہتا ہے تو کیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزوں سے کہا جائے کہ جو عہدے اور جو مناصب تمھاری بے نظیر فیاضی سے "ہندو مسلمانوں کے بجرے ہیں" آگئے ہیں مگر جو پہلے صرف "برطانوی جنٹلمینوں" کو ملا کرتے تھے وہ پھر تم ہندو مسلمانوں سے لے لو، ہم "مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کریں گے؟" لاہور کے فسادات کے بعد ہندو مسلمان افسرانِ پولیس نے تحقیقات و تفتیش شروع کر دی اور مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہیں کہ یہ افسرانِ پولیس لاہور کے ان تعلیم یافتہ شہریوں سے زیادہ سچی قوم پروری کے نمائندے ثابت نہیں ہوئے جن کی صحافت اور خوش بیانی نے یہ فسادات کرائے تھے اور جو خود اخباروں اور کمپنیوں کے دفاتر اور سرکاری دفتروں اور کالجوں اور اسکولوں میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے

اپنی ہی لگائی ہوئی آگ پر بجائے پانی کے تیل چھڑک رہے تھے اور خود ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کو کہ امن وامان کسی طرح قائم ہو جائے، ناکام کرا رہے تھے۔ لیکن کیا اس کا علاج یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استدعا کرتے کہ ان جھوٹے قوم پروروں کی جگہ سچے دشمنانِ قوم بھیجیے جو کسی کے ساتھ رعایت نہ کریں اور "ہر ہر دو لعنت" کہتے ہوئے ہندو مسلمانوں دونوں کا چالان کر کے انھیں عدالتوں سے سزائیں دلوائیں؟

میں نہیں جانتا کہ مسٹر اوگلوی کیسے آدمی ہیں۔ ان کو عشق ہندوستان سے ہے یا اپنی بیش قرار تنخواہ سے اور اس مطلق العنانی کے ساتھ بادشاہت سے جو صرف ہندوستان ہی میں انھیں نصیب ہو سکتی ہے، نہ کہ اپنے وطنِ مالوف میں لیکن جن افسروں کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ پہلے ہمارے پاس اس کام کے لیے ۱۲۰ افسر تھے مگر اب "اصلاحات" نے گھٹا کر انھیں فقط ۶۸ کر دیا ہے۔ ان کے متعلق میں ڈاکٹر صاحب سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ ۱۲۰ ہوں یا ۶۸ حقیقی طاقت آج بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ چاہتے کہ انصاف ہو، کوئی ملت کسی پر زیادتی نہ کر سکے، سب پہلے آدمیوں کی طرح، پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں، ان میں روز دنگا فساد نہ ہوا کرے، روز جوتیوں میں دال نہ بٹا کرے، روز سر پھٹول نہ ہو، تو پنجاب کب کا ان فسادات سے نجات پا چکا ہوتا اور جو بچے کھچے ۶۸ انگریزی افسر آج بھی اس کام پر مامور ہیں وہ اگر آج بھی یہ چاہیں تو لاہور اور ملتان جیسے فسادات آج بند ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت، وہ کمیشن جو آ رہا ہے اور "اصلاحات" کی "اصلاح" کی جو ضرورت ہے ان کا کیا حشر ہو گا اور ہندوستانیوں کو ملکی تو ملکی فوجی عہدے دیے جانے کا جو مطالبہ ہو رہا ہے اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اگر "فرعون ذی الاوتاد" کی یہ ۶۸ کھونٹیاں بھی زمین سے اکھاڑ کر پھینک دی گئیں تو پھر ہامان سے کہہ کر شعلہ پروہ اونچا محل کون بنوائے گا جہاں سے موسیٰؑ کا خدا نظر آ سکے؟ تب تو ساحر تک بلا اجازتِ فرعون راب ہارونؑ و موسیٰؑ پر ایمان لے آئیں گے اور فرعون کے اس فرمان کو کون واجب الاذعان سمجھے گا "انا ربکم الاعلیٰ" اور "انا قاہر فوق عبادی"؟

میں نہیں کہتا کہ آپ جھوٹی قوم پروری کے دامِ فریب میں پھنس جائیے، مگر مالوی جی اور لالہ جی، منجے اور کیلکر کے جال کی اس جال کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا ہے جو

لندن سے شملہ اور شملہ سے لاہور تک پھیلا ہوا ہے۔ میں تو ہندو مہا سبھا کے جال میں نہیں پھنسا مگر ڈاکٹر صاحب ضرور "ٹائمز" کی امت کے جال میں پھنس گئے۔ میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ شاید آج بھی ڈاکٹر اقبال کو اس کا سخت قلق ہے کہ مدت سے دل کی بستی سونی پڑی ہوئی ہے، لیکن میں اس کا ہرگز قائل نہیں کہ اس کا علاج اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس دیس میں ایک نیا شوالہ بنایا جائے جس میں بجائے لالہ لاجپت رائے کے مسٹر اوگلوی کی مورتی بٹھا دی جائے، چاہے برہمن برا مانے یا بھلا، میں نہ اس کے صنم کدے کے پرانے بتوں کو سجدہ کرنے کے لئے تیار ہوں نہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالہم کے ان نئے بتوں کو، جن کا وہ خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میرا تو دونوں بتوں کو دور ہی سے سلام ہے اور دونوں کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض ہے کہ ؎

فرشتوں نے کیا ہے ان کو سجدہ
نہیں اے بت یہ بندے تیرے بس کے (جوہر)

میں بھی ایک اونچے تیرتھ کی تلاش میں احرامِ سفر باندھ چکا ہوں اور یقیناً دنیا کے تیرتھوں سے میرا تیرتھ بھی اونچا ہے۔ اس کا کلس دامانِ آسمان سے ملا ہوا نہیں ہے بلکہ اونچے سے اونچے آسمان سے بھی زیادہ بلندی پر وہ عرش و کرسی بچھی ہوتی ہے جس پر میرے دیوتا کی وہ مورتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکے، نہ چھو سکے اور پھر بھی خود میری شہ رگ سے وہ قریب تر ہے۔ لیکن اس کا تو مجھے کبھی بھی شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اقبال کا اونچا تیرتھ فقط شملہ کی بلندی تک اونچا ہے۔

آج کا مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ کل انشاء اللہ میں اس "سچی" ملت پرستی کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا جس نے بظاہر ڈاکٹر سر محمد اقبال دام اقبالہم کو اجانب پرستی کی طرف مائل کر دیا ہے اور پھر "شمع و شاعر" کے مصنف سے پوچھوں گا کہ کیا وہ "شمع" کے پیغام کو خود بھی بھول گیا اور خود وہی "شاعر" بن گیا جس نے "شمع" سے ایک سوال کر کے وہ لاجواب جواب پایا تھا جو "بانگ درا" کا سب سے اونچا سُر ہے۔ قارئین کرام انتظار فرمائیں۔

شاعرِ اسلام اقبال

(۴)

میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے آج کل کی سیاسی قوم پروری کے ایک بڑے حصّے کے جھوٹے ہونے کا اعتراف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آج سچی چیز ہے کیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ ابتدائی کلام کل نذرِ قارئین کرام کیا گیا تھا جس میں انھوں نے اپنے حبِّ وطن کو نظم میں ظاہر فرمایا تھا اور جس کی ابتدا "ترانۂ ہندی" سے ہوئی تھی۔ کل کا مضمون ختم کرنے کے بعد تھک تھکا کر میں پلنگ پر لیٹ گیا اور جی چاہا کہ گریمو فون پر کچھ گانا سنوں۔ ۱۹۱۱ء کا ایک "ریکارڈ" لگایا گیا اور میرے برادر عزیز منظور محمود صاحب نے اپنی دلکش آواز پھر سولہ برس بعد مجھے سنائی۔ پہلا شعر ہی ایک تیر کی طرح جگر کے پار ہو گیا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

میں نے منظور صاحب کو (مرحوم) "علی گڈھ کالج" سے اسی کو سننے کے لیے بلایا تھا اور سن کر قلب پر اتنا اثر ہوا تھا کہ اٹھ کر سیدھا گریمو فون کمپنی کے منیجر صاحب کے پاس چلا گیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ اس کا "ریکارڈ" تیار کر دیں۔ منظور صاحب طالب علم تھے گویّے نہ تھے انھیں کوئی معاوضہ لینا مقصود نہ تھا مگر مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک رقم کا انتظام کر لیا گیا جو ہر ریکارڈ کے فروخت ہونے پر اسے ملتی رہے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں "کمریڈ" میں اس کے پورے صفحے کے اشتہار نکلنا شروع ہوئے اور اگر اسی مہینے میں جنگ طرابلس کے چھڑ جانے سے کفر و اسلام کی جنگ کا وہ سلسلہ نہ چھڑ جاتا جو کہیں بارہ برس بعد جا کر صلح لوزان پر ختم ہوا اور "کمریڈ" کے صفحات کو جس نے جدال و قتال کے حالات سے لبریز کر دیا تھا اور اسی پیمانے پر یہ اشتہار نکلتا رہا پھر بھی مدتوں تک نکلتا رہا۔

جب پہلی بار یہ اشتہار "دلاویز نظم، دلکش آواز، قومی امداد، ہم خرما و ہم ثواب" کی

ماخذ : روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء

سرخی سے نکلا۔ میں نے اس میں عرض کیا تھا کہ "ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے ہم وطنوں کے حبِ وطن کا اظہار ایک بے مثل نظم میں کیا تھا جو ہندوستان میں مقبول خاص و عام ہو چکی ہے۔ اب اپنی تازہ ترین نظم میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے حبِ اسلام کا اظہار کیا ہے اور یقیناً اس کی مقبولیت عالم گیر ہوگی۔ وطن اور مذہب کے تعلق کی بابتہ شاعر ایک شعر میں وہ مطلب ادا کر گیا ہے جو فلسفی کئی صفحوں میں ادا کرتے اور شاید پھر بھی ادا نہ کر سکتے۔ اسلاف کے کارنامے اور شعر ابھی بیان کر چکے ہیں، قوم کے اقبال کا ماتم بہت کچھ ہوا اور ہوگا مگر اقبال نے صاف بتایا ہے کہ جس قوم کو مسبب الاسباب کی طرف سے ایک ضروری پیغام بطور ودیعت کے سونپا گیا ہو جب تک سارے عالم کو وہ پیغام نہ پہنچایا جا سکے اس وقت تک اس کو تباہ و برباد کرنا آسان نہیں۔ اسلامی دنیا کے دیرینہ تنزل کے بعد اب پھر ہر طرف سے ترقی کی صدائیں پیامِ امید بن کر آرہی ہیں۔ کارواں سالار اب بھی وہی ہادیٔ قوم ہے جس کی آواز نے بجلی کے کڑکے کی طرح اب سے تیرہ سو برس پہلے ایک عالم کو سوتے سے جگا دیا تھا اور اقبال کا ترانہ دراصل بانگِ درا ہے جس سے آواز آرہی ہے کہ چلو بڑھو جلدی کرو۔ عجب نہیں کہ یہ دلکش نظم اقبال کی نجات کے لیے کافی ہو اور ہندوستان کے مسلمان بھی پکار اٹھیں، لبیک، لبیک یا رسول اللہ۔ کون ہے جس کے کان میں یہ بانگِ درا نہیں پڑتی۔"

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک محدود تھا اور "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "نیا شوالہ" سب اسی دور کی نظمیں ہیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دوسرا دور چلا اور ۱۹۰۸ء سے وہ آخری دور چلنا شروع ہوا جو بہ ظاہر اب تک چل رہا ہے۔ اس آخری دور کا آغاز "بلادِ اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے مگر اس طرح آتا ہے کہ ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰؐ — دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پا بندِ مقام — ہند ہی بنیاد ہے اسکی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو مادی ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں — صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اقبال اب حقیقت کی طرف جلد جلد ترقی کر رہے تھے اُس کے بعد "گورستانِ شاہی" پر جو نظم لکھی گئی اس میں البتہ چند شعر ایسے ہیں کہ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اب بھی بعض اوقات چیزوں پر ایک سطحی نظر ڈال رہا ہے ؎

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ یک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ اقبال بھی ان تاریخوں کے مؤلفوں کی طرح جو اسکولوں کی خواندگی میں داخل کی جاتی ہیں اقوام کو بادشاہوں سے ممیز نہیں کر سکے وہ خود پوچھتے ہیں کہ ؎

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل؟ — جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اور خوب کہتے ہیں کہ ؎

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور — جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور یہ بھی صحیح فرماتے ہیں کہ ؎

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار — رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

لیکن اگر مسلمان بھی ایک "قوم" ہیں اور کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسلام پر قائم رہیں تو پھر یہ ہرگز صحیح نہیں کہ ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو — مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو
ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگذر — چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں — دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے — عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا ؎ آسماں سے ابرِ آزاری اُٹھا، برسا، گیا

اگر یہ صحیح ہے تو صرف اس معنیٰ میں کہ خدا نئی نئی قوموں کو مسلمان کرتا رہے گا اور انھیں کے ذریعے سے ابد تک اسلام کو قائم رکھے گا۔

افسوس ہے کہ اقبال بھی نفس پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے کو "عہدِ رفتہ" سمجھے اور انھوں نے فرمایا کہ ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں ؎ اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

ہاں اس امت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے انھیں نے حضرت معاویہ رضؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحید الدین کے زمانے تک اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کو امت محمدیہ اور ملت اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی اور ہم کو تباہ و برباد کرایا۔ اقبال اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے مگر بحمد اللہ جنگ عمومی تک اس پر آپڑے اور خدا ضرور ان کو ان حقیقتوں کو آشکار کرنے کی جزائے خیر دے گا کہ ؎

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست ؎ گردنش از بندِ ہر معبود رست
مومن از عشق است و عشق از مومن است ؎ عشق را ناممکنِ ما ممکن است
عقل سفاک است او سفاک تر ؎ پاک تر، چالاک تر، بیباک تر
آں کند تعمیر تا ویراں کند ؎ ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن ؎ عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل گوید شاد شو آباد شو ؎ عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرامِ جاں حریت است ؎ ناقہ اش را ساربان حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد ؎ عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد
آں امامِ عاشقاں پورِ بتول رضؓ ؎ سروِ آزادے ز بستانِ رسول ﷺ
بہر آں شہزادۂ خیر الملل ؎ دوشِ ختم المرسلینؐ نعم الجمل
سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او ؎ شوخیِ ایں مصرع از مضمونِ او
موسیٰ ع و فرعون و شبیر رضؓ و یزید ؎ ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم

برزمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

تیغ بہر عزتِ دیں است و بس
مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

خون او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملّت خوابیدہ را بیدار کرد

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجات ما نوشت

رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیکِ دورافتادگاں
اشک ما بر خاکِ پاکِ او رساں

اس سے زیادہ بادشاہت کی کیا مذمت ہو سکتی تھی۔ کاش آج بھی اقبال کو کربلا کی فتح نمایاں اسی طرح یاد ہوتی اور ارضِ پاکِ حجاز میں "یزیدیت" کے مقابلے کے لیے وہ بھی "شبیریت" کا عَلَم لے کر نکلتے اور بجائے کونسل کے داخلے کے موتمر عالمِ اسلام میں شرکت فرماتے "گورستانِ شاہی" میں انھوں نے مسلمؓ کو بھی یزید کی طرح رخصت کر دیا لیکن "رموزِ بیخودی" میں وہ صحیح راستے پر آ پڑے اور انھوں نے خوب فرمایا کہ ؎

در بہاراں جوشِ بلبل دیدۂ
رستخیزِ غنچہ و گل دیدۂ

چوں عروساں غنچہ ہا آراستہ
از زمیں یک شہرِ انجم خاستہ

غنچۂ بر می دمد از شاخسار
گیرد ش بادِ نسیم اندر کنار

غنچہ از دستِ گلچیں خوں شود ۔ از چمن مانندِ بو بیروں رود
بست قمری آشیاں بلبل پرید ۔ قطرۂ شبنم رسید و بو رمید
رخصتِ صد لالۂ ناپایدار ۔ کم نسازد رونقِ فصلِ بہار
از زیاں گنجِ فراوانش ہماں ۔ محفلِ گلہائے خنداں نفس ہماں
فصلِ گل از نسترن باقی تر است ۔ از گل و سرو و سمن باقی تر است
ہمچناں از فرد ہائے پے بپے ۔ ہست تقویمِ امم پایندہ تر
در سفر یار است و صحبت قایم است ۔ فرد رہ گیر است و ملت قایم است
فرد پورِ شصت و ہفتاد است و بس ۔ قوم را صد سال مثلِ یک نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن ۔ زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات ۔ مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد ۔ از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
امتِ مسلم ز آیاتِ خدا است ۔ اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پروا ستے ۔ استوار از نحن نزلنا ستے
ذکر قایم از قیامِ ذاکر است ۔ از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است ۔ از فسردن ایں چراغ آسودہ است
ما کہ توحیدِ خدا را حجتیم ۔ حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم
آسماں با ما سرِ پیکار داشت ۔ در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
بند ہا از پا کشود آں فتنہ را ۔ بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را
خفتہ صد آشوب در آغوشِ او ۔ صبحِ امروزے نزاید دوشِ او
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید ۔ دید بغداد انچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس ۔ زاں نو آئینِ کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریاں گلزار کیست ۔ شعلہ ہائے او گلِ دستارِ کیست
زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمی است ۔ ہم بمولیٰ نسبتِ ابراہیمی است

از تہِ آتش برانداز یم گل | نارِ ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار | چوں بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند | آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست | رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند | استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست | ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است | امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است | از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

تعجب ہے کہ جو شخص جانتا تھا کہ شوکتِ شام و فرِ بغداد و سطوتِ غرناطہ اس میں اسلام کی حقیقت نہ تھی بلکہ اس کی حقیقت تھی تو مدینہ منورہ میں اور کربلائے معلیٰ میں تھی۔ جو شخص جانتا تھا کہ بغداد پر وہ کچھ گذرا جو روما پر نہ گزرا پھر بھی تاتاریوں کے اٹھاتے ہوئے محشر کا یہی نتیجہ نکلا کہ ہلاکو ہی کی قوم نہ صرف مسلمان ہوئی بلکہ اس نے از سر نو یورپ میں داخل ہو کر اس کی زمین میں پھر اسلام کا جھنڈا گاڑا اور ہلاکو کی تباہ کی ہوئی خلافت کو پھر زندہ کیا اور چار سو برس تک زندہ رکھا۔ جو شخص جانتا تھا کہ رومیوں کی گرم بازاری اور ان کی جہانگیری اور جہانداری آج باقی نہیں، ساسانیوں کا شیشہ چکنا چور ہو گیا، خمخانۂ یونان کی رونق نہ رہی اور مصر بھی فراعنہ کی ہڈیوں کی طرح اہرام کے تلے دب گیا، اگر بانگِ اذاں جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی آج بھی ہے اور ملتِ اسلامیاں اگر نہ رہے گی تو دنیا بھی نہ رہے گی کیونکہ

ع گلستاں میرد اگر میریم ما

وہ بادشاہوں کے اجڑے ہوئے گورستان کو دیکھ کر یہ کس طرح کہہ سکتا کہ

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا | آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا برسا گیا

یقیناً اس وقت تک حقیقت کا پورا پورا انکشاف نہ ہوا تھا مگر یہ ظلم ہوگا کہ میں اس کو بھی ظاہر نہ کردوں کہ اس نظم کے آخر میں اقبال نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ؎

دہر کو دینے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادی گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

تاہم میرے نزدیک جو کچھ اسلامی بادشاہوں نے دکھایا وہ اکثر اسلام کی شانِ جلالی کا بھی ظہور نہ تھا۔ وہ شانِ جلالی جو ہر زبردست زیردست کو دکھا سکتا ہے اسلام کی شانِ جلالی نہیں۔ اسلام کی شانِ جلالی کو تو صرف وہی دکھا سکتا ہے جو اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکے اور جو ابھی اسلام کی شانِ جمالی دکھا سکتا ہے وہ یقیناً اس کی شانِ جلالی بھی دنیا کو ایک بار پھر دکھا دے گا۔ میں نے اقبال کی اردو اور فارسی نظموں سے اتنے طول طویل اقتباسات بلا وجہ نہیں دیے ہیں۔ قارئین کرام ذرا صبر فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون سے ان کا کتنا قریبی تعلق ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اقبال کی شاعری کا جو تیسرا دور ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا اور اب تک جاری ہے اس کی ابتدا ان دو نظموں سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اس تمام دور کی شاعری کا لب لباب اور "مشتے نمونہ از خروارے" وہی "ترانۂ ملی" تھا جس کا ذکر آج کے مضمون کو شروع کرتے ہی میں نے کر دیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آج کون ہے جس نے یہ ترانہ نہیں سنا ہے لیکن پھر بھی دل مجبور کر رہا ہے کہ اس کے وہ شعر نقل کر دوں جن میں ملت اسلامیہ کی تفسیرِ حیات اور ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر کا اظہار کیا گیا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اسی "ترانۂ ملی" کے بعد "وطنیت" پر اقبال کی نظم ہے جس کا پہلا بند یہ ہے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس نظم میں وہی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جن کا "رموزِ بیخودی" میں اسلام کو تہذیبِ مکانی سے آزاد ظاہر کرنے کے متعلق اظہار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے "وطنیت" کی تقسیم کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسلام کی قومیت ساری نوعِ انسان پر حاوی ہے اور اقبال نے طارق کے منہ سے اس خیال کا بہترین طریقے پر اظہار کر دیا ہے۔ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اپنی اُردو نظموں کے مجموعے کا نام انھوں نے "بانگِ درا" رکھا ہے اور وہ اسی "ترانۂ ملی" سے لیا گیا ہے جس کے ذکر سے اس مضمون کی ابتدا کی گئی تھی یہ یقیناً ع

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

اور اس نے اقبال کے پہلے خیال کی کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تردید کر دی اور اس کی اس طرح تصحیح کر دی کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن جھوٹی قوم پروری پر ناک بھوں چڑھانے والے اقبال، ان کی اجانب پرستی

پر "نہیں" "نہیں" کہنے والوں کی آوازوں کو ایک کڑک مرغی کی ککڑوں کوں کا لقب دینے والے اقبال کیا دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ آج ان کی سچی خدا پرستی اور ملت پروری کی نمایندگی خود ان کی ملت کی ککڑوں کوں جو اس کے اخبارات اور اس کی تقریروں میں سنائی دیتی ہے، کر رہی ہے؟ جس پنجاب کونسل میں جاکر اور اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھ بوجھ کر انھوں نے اپنے تئیں مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کرنے کے لیے اس قدر مستعد ظاہر فرمایا۔ اس میں کے تقریباً نصف منتخب شدہ نمایندے مسلمان ہیں۔ اگر انھیں کا "تربیت الدجاج" والا استعارہ استعمال کیا جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ ان ککڑوں کوں کرنے والی مرغیوں میں سے کتنی ہیں جو خدا پرستی اور ملت پروری کا انڈا اب تک دے رہی ہیں۔ اتفاق سے آجکل چین میں ایک عظیم الشان انقلابی تحریک رونما ہے اور عرب میں بھی مؤتمر عالم اسلام کی ابتدا ہوئی اور پھر "یزیدیت" نے اس "شبیریت" کو دبا دیا اور وہ عشق جو ہماری ناممکنات کو ممکن ثابت کرنا چاہتا تھا بظاہر پھر عقل کی چالاکی اور سفاکی سے دب رہا ہے۔ کیا ہندوستان کے مسلمان اپنی افسردگی اور اس مردنی سے جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے ثابت کر رہے ہیں کہ چین بھی ان کا ہے اور عرب بھی ان کا؟ خود انھیں کے پنجاب سے جو ہندوستان بھر میں "وطنیت" کی بدترین مثالیں پیش کر رہا ہے، بار بار یہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں کہ چین تو کہاں کا ترکی اور حجاز تک سے ہمیں قطع نظر کر کے اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونے کے صرف یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت کی کتنی ملازمتیں دلوائی جائیں اور مسلمانوں کی "قوم" کے معنی زیادہ تر اس سیاسی اور مذہبی قاموس میں یا تو اپنی ذات شریف ہیں یا بیٹا بھتیجا بھانجا داماد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہمت ہوئی تو یہی کہ وکلا اور بیرسٹر صاحبان ان جلسوں سے خود تو علیحدہ رہے جن میں کنور دلیپ صاحب کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا اور سر شادی لال پر ہندو نوازی کے الزامات لگائے گئے لیکن دوسروں کو اس سے ہرگز نہ روکا گیا بلکہ کچھ ترغیب و تحریص ہی دی گئی، بالخصوص اخبار نویسوں کو جن سے جیلیں بھری جا رہی ہیں یا کسی سب جج صاحب نے ایک خط لکھ مارا کہ واقعی سر شادی لال صاحب ویسے ہی ہیں جیسا کہ ان کو ایسن صاحب نے لکھا تھا۔ جو تردید

کی گئی ہے وہ صرف ان کے چند خدام کی طرف سے کی گئی ہے ۔ آپ ایک کمیشن بنوا کر سب سے خلیفہ بیانات لیں اور میرے اس خط کو آپ شائع فرما سکتے ہیں مگر مصلحتاً میرا نام درج نہ فرمائیں ۔

یہ ہے سچی خدا پرستی اور سچی ملت پروری کی لکڑیوں کو، جھوٹی "تحریری تبلیغ" کے لیے "فریبیوں کے اخبار"[۱] کی فائل کو کتاب کی شکل میں چھپوا کرا کے "نمونۂ جنگ صفین" کا نام دے کر اب بھی پیسہ بٹورا جا رہا ہے اور اب کتب فروشی کی توسیع "جھنڈا فروشی" سے کی جا رہی ہے اور "نشانِ عشقِ محمد" کے نام سے زرد جھنڈے بیچے جا رہے ہیں جن کے رنگ کے متعلق ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ حضور آصف جاہ نظام الملک کا شاہی رنگ ہے ، ۔ ۱۲ ربیع الاول کو جشن میلاد منایا جائے ۔ اس دن (بظاہر آریہ سماج کی تقلید میں) جلوس نکالے جائیں اور ان حضور نظام کے لئے دعائیں مانگی جائیں جن کے خلاف اسی غدار اور جاسوس نے اسی برطانوی حکومت سے جو ان کو پریشان کر رہی ہے جاسوسی کی تھی کہ انھیں وحدت اسلامیہ کا سبق پڑھایا جا رہا ہے ۔ اس لیے جو جھنڈے جلوسوں میں نکالے جائیں ان کا رنگ زرد ہو

جب میں نے اس غداری اور مکاری کا راز فاش کرنا شروع کیا تھا تو میرے ایک فاضل نے فرمایا تھا کہ میاں جو کچھ تم کر رہے ہو بالکل درست ہے ۔ مگر وہ مسلمانوں کو اس کے بعد بھی الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتا رہے گا ۔ ع

چو احمق در جہاں باقیست مفلس در نمی ماند

جتنی مسلمانوں کی حالت خراب ہے اتنی ہندوستان میں کسی ملت کی نہیں تعلیم ندارد، تجارت خراب، صنعت و حرفت میں اب مل اور مزدوری کی جگہیں بھی ہندو مل والے ان سے چھین رہے ہیں ۔ ان میں سے ایک پیسے کے لیے بھی روپیہ نہیں ملتا مگر "زرد جھنڈوں" کے جلوس کے لیے "نشانِ عشقِ محمد" کے جھنڈے اس اپنی دنیا فروش سے ضرور خریدے جائیں گے ۔ سچی ملت پرستی کی یہ مرغی ہرگز کڑک نہیں ہوئی ہے ۔ یہ برابر انڈے دے رہی ہے اور پیسہ بٹور رہی ہے ہر مسلمان فوراً اپنے مقام کے لیے چندہ کر کے دس بیس جھنڈے منگالے تاکہ ہر مسجد، ہر اسلامی اسکول، ہر اسلامی مکتب اور ہر مسلمان گھر پر یہ محمدی جھنڈا لگایا جائے اور

---

[۱] خواجہ حسن نظامی کے اخبار "غریبوں کا اخبار" کی طرف اشارہ ہے ۔ اس میں مولانا محمد علی کے الزامات کے جواب میں اور ان کے خلاف جو کچھ چھپا یا تھا اسے "نمونۂ جنگ صفین" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا تھا ۔
(ابو سلمان شاہ جہان پوری)

جلوس کے دن یہ جھنڈے سب مسلمان ہاتھوں میں لے کر نکلیں۔ "بہت جلد منگاؤ ورنہ پھر ان کا ملنا مشکل ہو گا" یہ ہے اس سچی ملت پروری کی ککڑوں کوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال دام اقبالہم کے دوست سر عبدالقادر نے حمایت اسلام کے اسی جلسے میں جس میں اس فریبی نے ساڑھے چار سو برس سے ایک مسلمان خاندان کے سردار ٹھاکر صاحب آمود کو "نو مسلم مہارانا بنا کر لاہور کے بازاروں میں سے جلوس کے ساتھ سر محمد شفیع کی معیت میں نکالا تھا۔ اس کا رونا رویا تھا کہ مسلمانوں کے ہزاروں کام ایسے پڑے ہوئے ہیں جن کے لیے روپیہ اور پرجوش کام کرنے والوں کی ضرورت ہے لیکن پرجوش مسلمانوں کا جوش اور روپیہ دونوں محض نمایشی کاموں میں اور فضول اظہار جوش و خروش میں برباد کیا جاتا ہے۔ اس فریب کا اچھی طرح بھانڈا پھوڑ دیا گیا مگر آج بھی یہ فریبی "منادی"[1] کے پوسٹروں میں ظاہر کر رہا ہے کہ ٹھاکر صاحب آمود نے معہ اپنی ساڑھے پانچ لاکھ کی راجپوت قوم کے "قبول اسلام" کیا ہے گویا ساڑھے چار سو برس تک ان کے مسلمان آبا و اجداد سب کافر تھے اور بظاہر ملکانہ کے مسلمانوں کو بھی شردھانند صحیح طور پر کافر ظاہر کیا کرتے تھے (نعوذ باللہ من ذالک) اور اس قبول اسلام کی کتاب فروخت کی جا رہی ہے۔ یہ ہے ۱۹۰۸ء سے آج تک ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ملت پروری کا نتیجہ۔ یقیناً آج جب کہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا یہ کہنا قطعاً جھوٹ ہے کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور یہ تو اس سے بھی زیادہ جھوٹ ہے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا　　میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

لیکن کیا یہ اس سے زیادہ سچ ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

چین انگریزوں کا امریکنوں کا ہے یا جاپانیوں کا ہے یا شاید روسیوں کا ہو جائے یا خدا کرے) پھر چینیوں کا ہو جائے جن میں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصہ عنصر ہے لیکن یقیناً ہمارا تو آج ہرگز نہیں ہے اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں کا یا یہودیوں کا یا نجدیوں

---

[1] خواجہ حسن نظامی کا ماہوار رسالہ منادی، دہلی۔ اب بھی نکل رہا ہے (ابو سلمان شاہ جہانپوری)

کا اور یمنیوں کا، لیکن جہاں حضرت خدیجہ کا مکان شہید کرا دیا جائے اور اس میں بول دبراز کیا جائے اور اس کی شکایت کی جائے تو اقبال صاحب کے پنجابی بھائی اسمٰعیل غزنوی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے فرمائیں کہ کیا (نعوذ باللہ من ذالک) خود خدیجہ رضؓ وہاں بول دبراز نہیں کیا کرتی تھیں۔ جہاں مولدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیا جائے اور عورتوں تک کے سامنے وہاں لوگ پاجامہ کھول کر پیشاب کرنے کے لیے برہنہ بیٹھیں جیسے کہ خود میرے، میری بہن اور میری بیوی کے سامنے ایک شخص بیٹھا تھا۔ جہاں امہات المومنین رضؓ اور اہل بیت رضؓ کی قبروں کے نشان تک نہ چھوڑے جائیں، جہاں احد کی مساجد تک شہید کرا دی جائیں اور ہم کچھ نہ کر سکیں وہ عرب بھی ہمارا نہیں ہے۔ رہا ہندوستان بظاہر وہ اب لالہ لاجپت رائے کا ہے، اور ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب چاہتے ہیں کہ اب وہ مسٹر اوگلوی کا ہو جائے۔ طبیب حاذق کا یہ نیا نسخہ ہے۔ جس کا جی چاہے اسے بندھوا لائے اور گھول کر اور پیس کر یا جوش دے کر اسے پیے لیکن مجھ جیسے عطائی کو تو اس سے شفا کی ہرگز امید نہیں۔

"شمع وشاعر" کے مصنف سے ایک سوال

(۵)

مجھے چند نہایت ضروری مضامین لکھنا تھے مگر انسدادِ توہین انبیاء و بزرگان دین کے راستے میں جو دشواریاں خود ہمارے بھائیوں نے صراطِ مستقیم گم کر کے پیدا کر دیں ان کے باعث ۲۶/ جون سے آج تک کوئی دوسرا مضمون نہیں لکھ سکا تھا البتہ سر محمد اقبال کی شملہ والی تقریر نے اس سلسلے کو بند کرا دیا اور ساری نہیں (کیونکہ اس سلسلے میں کام اب تک جاری ہے) تو کم سے کم آدھی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جو کچھ مجھے اس سلسلے میں لکھنا تھا وہ بھی تقریباً لکھ چکا۔ البتہ آج ان کی نظم "شمع وشاعر" سے کچھ اقتباسات دے کر ان سے ایک سوال انھیں کی زبان سے کرنا ہے۔

وہ آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہ کرو۔ جب تک اس کو رام نہ کر لوگے ہندوستان کو آزاد نہ کرا سکو گے، سوراج نہ لے سکو گے، اس کے استیصال کا خیال حماقت نہیں جنوں ہے۔ جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا تھا تب اس کے استیصال کا اچھا موقع تھا۔ تم نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ جب محمود غزنوی سترہ بار ہندوستان آیا اور سارے ملک میں گھوما گھوما پھرا مگر وہی چند ہزار فوج کے ساتھ، تب بھی موقع تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے اس وقت بھی تم نے اس کا استیصال نہ کیا اور موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری آیا اس وقت بھی اس کے استیصال کا موقع تھا لیکن تم نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے دیا۔ غلاموں کے خاندان تک نے یہاں بادشاہی کی اور بہ ظاہر تم نے اسے بھی قبول کر لیا۔ خلجی، تغلق اور لودھی سب باری باری حکومت کرتے رہے اور تم نے کسی کا بھی استیصال نہ کیا، وہ خود ہی ایک دوسرے کا استیصال کرتے رہے۔ پھر ایک فرغنہ سے بھاگا ہوا مغل تیمور لنگ کے خاندان کا ایک چغتائی بابر

ماخذ: روزانہ ہمدرد، دہلی۔ ۲۱ر اگست ۱۹۲۷ء

یہاں آیا اور تم نے اس غریب الوطن کی اس طرح مہمان نوازی کی کہ سارا گھر بار اسے دے ڈالا۔ اس کے بیٹے کو یہاں سے نکالا بھی تو اس کے بھائیوں نے یا مسلمان پٹھانوں نے اور ان پٹھانوں کے ہاتھوں سے بھی عنانِ حکومت نکلی تو پھر اسی کے ہاتھوں میں آگئی اور اس کے بعد بھی بنیے بقال اس ملک کی حکومت کو مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے جو رانا سانگھا جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے اور ایک مغل بچہ اکبر نامی پھر اس پر حکمران ہو کر رہا۔ تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آگئے تھے مغلیہ حکومت سے بھڑ دیا تب بھی سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دو مذہبی جماعتوں کے تین بن گئیں۔ جب اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد چند ہی سال تک کئی بار بھائیوں بھائیوں میں پھر تخت کے لیے جنگ چھڑی اور جو جیا وہ بھی عیاشی میں پڑ گیا اور وہ مرہٹوں کی قوت جس کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کا عزم بالجزم کر کے اورنگ زیب دہلی کو چھوڑ کر دکن گئے تھے اور ۲۶ برس تک جب تک کہ وہ اور زندہ رہے اس میں مصروف رہے اور بالآخر اس قوت کو دبا کر ہی انھوں نے دم لیا، اور دم دیا تو وہ قوت پھر بڑھنے لگی اور ایک سیواجی کی جگہ چار چار مرہٹے راجہ برہمن پیشوا کے درباری بنے اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف کر کے چھوڑ دیا تو سب نے مل کر اتنی ہمت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اس وقت بھی ایک غریب الوطن پٹھان احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کو اس طرح شکست دی کہ پھر کبھی اس قوم نے شمال کا رخ نہیں کیا۔ بھاؤ جی سندھیا جیسا بہادر پانی پت سے اس طرح بھاگا تھا کہ ساری عمر وہ اس تعاقب کرنے والے پٹھان کو نہ بھولا جس کا چھوٹے قد کا گھوڑا اس کے پیچھے برابر چلا آرہا تھا اور اس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی بھاپ جسے وہ بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا تو لرز جاتا تھا ساری عمر اسے خواب میں ستاتی رہی۔ وہ آخری موقع تھا کہ تم اس اقلیت کا استیصال کر سکتے مگر تم نے اس کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے غضب کیا کہ تم کو تباہ بھی کر دیا اور خود یہاں قیام نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت نکل گئی اور تمھیں بھی نہ مل سکی۔ اگر سات ہزار میل کے فاصلے سے سات سمندر پار کر کے کچھ سوداگر جہانگیر کے دربار میں تجارت کرنے کی اجازت لینے آئے تھے انھیں نے جہانگیر کے وارث اندھے شاہ عالم کو دو

سو برس بعد اپنی "حفاظت" میں لے لیا اور اس کی اور تمھاری دونوں کی رہی سہی طاقت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔

اب اگر اس غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں، ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں مگر اس غلامی کو ہرگز برداشت نہ کریں گے جس میں تم بھی سوڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی۔

نہ ڈاکٹر صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں ان سے کہیں کہ گویہ یقینی امر ہے کہ تمھیں ایک خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے سب دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم "الدالخصام" سمجھتے ہو جو ان اصولوں سے جن پر اسلام مبنی ہے کبھی تمھارے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے اور ان اصولوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جو تمھارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہیں جو تمھیں سب سے زیادہ خائف کیے ہوتے ہیں اور اگر ہو سکے تو ان کے خلاف اوروں کو اپنا اسی طرح حلیف بنالو جس طرح کہ رسولِ اکرمؐ نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا گو بعد کو انھوں نے دغا کی اور اس کی خوب ہی سزا پائی اور بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ سب کے سب کو یا تو دیس نکالا دلایا قتل کر دیے گئے اگر کوئی جماعت بھی تمھارے سیاسی تدبر سے رام ہو کر تمھاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذِ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور اس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے پورا زور لگا دو اور جگر صبر و ضبط سے کام لو جب سب سے بڑے محاذِ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائیگی اور اس وقت ایک ایک کر کے ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا۔ یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اس کو عزم امور کہتے ہیں۔ وان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور، (اگر تم صبر کرو گے اور خدا ہی سے ڈرو گے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔) اگر چین و عرب بھی تمھارا ہے اور ہندوستان بھی تمھارا ہے اور تم مسلم

ہو سارا جہاں تمہارا وطن ہے تو اسی دشمن کو اَلدّ الخصام سمجھو جو سارے جہاں پر حاوی ہونا چاہتا تھا یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے۔ اس غریب کی تگ و دو تو سمندر کے کنارے تک ہے، جو دنیا "کالے پانی" کے اس پار ہے اس سے لے کیا واسطہ، یہ تو گولر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اسی گولر میں محدود ہے۔ ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو۔

ریل کے کسی ڈبے میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں ان سے ڈر لگے گا؟ بعض اوقات تو انھیں کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ البتہ اگر اس ڈبے میں دو چار گورے ہوں تب تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے اور اسی کا فکر رہتا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں دبوائیں گے۔ آج اگر ہندو تم پر ظلم کرتے ہیں، تمہارے سیاسی اور مذہبی حقوق کو پامال کرتے ہیں، تمہارے تہواروں میں تم سے جنگ آزما ہوتے ہیں اور تمہاری عبادتوں میں خلل ڈالتے ہیں تو یہ بھی اس لیے کہ حکومت تمہاری اور تمہارے حقوق کی حفاظت میں کوتاہی کرتی ہے ورنہ جس حکومت نے ترک تعاون کی تحریک کو شکست دے دی وہ کیا ہندو جاتی کو نہیں دبا سکتی۔ وہ ان کے مقابلے میں آج بھی تمہیں سے زیادہ ڈرتی ہے خیر اگر تم کو ان سے لڑنا ہی ہے تو کس ہتھیار سے لڑو گے؟ لٹھ پونگے میں تم اب بھی ور رہتے ہو پھر پہلوانوں کے دنگل کرا کے تنظیم کرانے سے کیا حاصل۔ اگر آج انگریز بیچ میں کود نہ پڑیں تو تم اب بھی ان سے بھگت لے سکتے ہو مگر بھلا انگریز تمہیں بھگت لینے دیں گے۔ ایک جگہ بھی تو آج تک دن بھر لڑائی نہ ہونے پائی۔ پولیس آجاتی ہے، فوج آجاتی ہے اور تم بالآخر ان سے نہیں اس سے ڈر کر اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے اور کوتوالیوں اور کچہریوں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جن مسلمانوں کے لیے تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتے تھے کہ سرکاری نوکریاں انھیں دی جائیں وہ تو اس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار ان کو متعصب اور طرف دار سمجھ کر برخاست نہ کر دے بعض اوقات خود ہی ناکردہ گناہ مسلمانوں تک کو پھنسوا دیتے ہیں۔ سہارن پور میں کیا ہوا، علی گڈھ میں کیا ہوا۔ وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود تمہارے قول کے مطابق اپنے ججوں تک کو چھڑا دیتے ہیں اور جو ہندو سبھا کے صدر سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس محلے میں اور کس بازار میں اور کس گلی میں زیادہ

پولیس لگائی جاتے اور کس میں کم جب مقدمات کچہری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے یہاں وکیلوں کا کال پڑ جاتا ہے۔ خود تمہارا بیان ہے کہ عبدالرشید کے مقدمے میں ایک بیرسٹر صاحب نے چار سو روپیے روز کے رکھوا لیے اور اگر شب ماقبل میں آٹھ بجے سے پہلے یہ رقم وصول نہ ہو گئی تو بوریا بندھنا باندھا اسی وقت اسٹیشن کا رخ کرنے کی دھمکی دی۔ نہ سیشن میں، نہ ہائی کورٹ کی اپیل میں کسی نامور مسلمان بیرسٹر نے پوری فیس لے کر پیروی کرنا قبول کیا۔

اس کی شکایت وکیلوں سے کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ روزمرہ تو مسلمان اپنے مقدمات کی پیروی کے لیے ہندو وکلاء کو بیش قرار فیس دیا کرتے ہیں لیکن جب فسادات واقع ہوتے ہیں اور یہ پکڑے جاتے ہیں تو مفت مقدمہ چلانے کے لیے ہم سے امید رکھی جاتی ہے۔

جب حالت یہ ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں تک ہو بچا جائے اور لٹھ پونگے کے اس قدر مستعدی کے اظہار سے اپنے تئیں اس جنگ میں مارے جانے سے بچایا جائے جس میں چھریاں اور تلواریں خون نہیں بہایا کرتیں اور جس میں بندوقیں اور ریوالور آگ نہیں برساتے بلکہ جن میں بہی کھاتوں پر قلم چلا کرتا ہے اور سود در سود کے ذریعے سے خون چوسا جایا کرتا ہے اور خرچے سمیت ڈگریاں اور قرقیاں دل جلایا کرتی ہیں۔ اگر سرکاری ملازمتیں ہی تمہیں تمہارا رزق پہنچا سکتی ہیں تو پھر مدارس کیوں نہیں قائم کرتے امتحان کیوں نہیں پاس کرتے اور ڈگریاں حاصل کر کے یا مقابلے کے امتحانات میں بیٹھ کر اور سب سے آگے رہ کر نوکریاں کیوں نہیں مانگتے۔

نہ ڈاکٹر صاحب کو وہ پرانا نسخہ ہی آج یاد آتا ہے جو اس نبی کریمؐ نے لکھا تھا جو حکمت کو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی پونجی بتلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اسے جس کے پاس دیکھو اس سے چھین لو۔ جس کی وہ کھوئی ہوئی پونجی ہے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے بہ نسبت اس کے جسے وہ کہیں پڑی ہوئی مل گئی ہو۔

صحیح تنظیم سنگھٹن کی نقل نہیں ہے نہ جذبۂ انتقام سے اسے کوئی واسطہ، اگر ہندو بجائے تمہارے دشمن ہونے کے تمہارے سب سے زیادہ چہیتے دوست بھی ہوں اور سنگھٹن کا نام تک نہ لیں تب بھی تمہیں اپنی تنظیم تو کرنا ہی ہے اور اس کے لیے سنت مالویہ پر چلنے کی مطلق ضرورت نہیں، سنت محمدیہ موجود ہے۔ اسی پر چل کر مسلمان منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ جب تم نے اور کسی دشمن میں لڑائی ہو تو کیا ضرورت ہے کہ وہی ہتھیار استعمال کیا جائے جو اس کے

پاس ہے "جادلھم بالتی ھی احسن"، ہی کے ہتھیار سے بھی جو ہتھیار بہترہودہ کیوں نہ استعمال کیا جائے آج اگر مسلمان "اقامت الصلوۃ" ہی کے رکنِ دین پر عامل ہونے لگیں تو فتح انھیں کی ہے۔ مگر یہاں تو ساری دینداری مسجدوں کے سامنے باجانہ بجنے دینے میں ختم ہو گئی ہے۔ مسجدوں میں جاکر نماز سنّو میں سے بہ مشکل پانچ پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کو اس کا زیادہ خیال ہے کہ ٹخنے سے ٹخنہ اور گھٹنے سے گھٹنا مل جائے چاہے دل سے دل ملے یا نہ ملے اور فکر ہے تو اس کی کہ میاں تم ہاتھ کہاں باندھتے ہو، آمین بالجہر کہتے ہو یا نہیں، رفع یدین کرتے ہو یا نہیں کرتے، تمہارا پاجامہ گھٹنوں تک آتا ہے یا ٹخنوں سے نیچا ہے۔ اس کی کتنوں کو فکر ہے کہ میرے پاس نماز پڑھنے والے کے کپڑے تو اس قدر بوسیدہ ہیں کہ ستر عورت مشکل ہے اور میں اس قدر چکن پٹ ہوں کہ چاوڑی بازار اور ٹبی کی "زیادہ خرچ بالانشین" عورتوں کو مات ہے۔ اگر اقامت الصلوۃ صحیح طریقے پر کی جاتے تو مسلمانوں سے زیادہ منظم تو جرمن کی فوج بھی نہ ہو اور جرمن کی فوج پر تو لارڈ نارتھ کلف کے پروپگنڈے کا جادو چل گیا تھا۔ اس فوج پر جو خدائی فوج داروں کی فوج ہے بھلا کس کا جادو چل سکتا ہے۔ پوری حریت اور پوری آزادی اور پوری جمہوریت سے اس کا امام چنا جائے اور ووٹ یورپ اور امریکہ کی طرح اپنی ذاتی خواہشوں کی پیروی میں نہ دیے جائیں بلکہ اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق۔ لیکن جب اس طرح امام چن لیا جائے اور نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ نہ رہے تو پھر تو اسی وقت تک جب تک کہ وہ حکم الٰہی اور سنت نبوی کی پیروی کرتا رہے اس کا اتباع اس طرح کیا جائے کہ کسی فوج کے جنرل کا بھی کبھی نہ ہوا ہو اور سمعنا واطعنا کا منظر ایک عالم کو پھر دکھلا دیا جائے۔ اسی طرح روزہ ہے بشرطیکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سا اور آپ کے صحابۂ کرام رض کا روزہ ہو، نہ کہ ہمارا جس کی شان میں غالب نے کیا خوب لکھا ہے کہ ؎

تن پروریِ خلق فزوں شد ز ریاضت ۔۔۔ جز گرچیِ افطار ندارد رمضاں ہیچ

زکوٰۃ کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ اس کے بعد نہ "چندہ ماموں"، کو چندہ مانگنے کی ضرورت پڑے نہ "خواہر زادہ"، کو، نہ "روتے والا لیڈر" رو رو کر مفتی محبوب علی[1] شہید کی بیوہ کے لیے دو دو آنے

[1] مفتی محبوب علی خواجہ حسن نظامی کے خسر تھے ۱۹۲۷ء میں دہلی میں قتل کر دیا گیا تھا (ابو سلمان شاہجہان پوری)

چار چار آنے جمع کرے، نہ ہنسنے والا پیر ہنس ہنس کر مسلمانوں کی جیب سے ایک کروڑ دھنے نکلوا کر اور اپنی سرکار کو پوسٹ کارڈ لکھوا کر اس کے خزانۂ عامرہ میں تین لاکھ ساڑھے بارہ ہزار داخل کرائے۔[1]

حج اس سارے نظام کی چوٹی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کی قربانیوں کی یاد کو تازہ کرنا اور جاننا کہ یہ سب اسی لیے کی گئی تھیں کہ اے وادیٔ غیر ذی زرع، میں افضل البشرؐ افضل الانبیا سرورِ کونینؐ باعث تکوین دو عالم کو پیدا اور مبعوث ہونا تھا اور خیر الامم کے ذریعے سے خدا کا آخری پیغام چار دانگ عالم میں ہر سننے والے کو سنوانا تھا اور پھر جو اس پیغام کو قبول کر چکے ہیں ان کا آپس میں مشورہ کرنا کہ جنھوں نے اب تک اسے قبول نہیں کیا ہے انھیں کس طرح اس پر آمادہ کیا جائے۔ جو رکاوٹیں وہ اس کام میں ڈال رہے ہیں ان کو کس طرح دور کیا جائے اور خود اپنی اصلاح کس طرح کی جائے یعنی دوسرے اور مختصر الفاظ میں موتمر عالم اسلام کا منعقد کرنا۔ آج اگر یہ ہوا کرے تو پھر کون مسلمانوں کو شکست دے سکتا ہے۔ لیکن یہ تو بعد کے چار ارکان ہیں۔ پہلا رکن دین تو وہ ایمان ہے کہ ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ہ فان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولہا بین الناس ج ولیعلم اللہ الذین آمنوا ویتخذ منکم شہدا واللہ لا یحب الظلمین ہ ولیمحص اللہ الذین آمنوا ویمحق الکفرین ہ (اگر مصیبت آپڑی ہے تو سست نہ ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم اللہ پر اعتماد رکھتے ہو اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو تمھارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور یہ دن باری باری ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ امتحان کرے کہ کون اس پر اعتماد رکھتے ہیں اور یہ کہ تم میں سے شہیدوں کو چن لے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ظلم کرنے والے سے کچھ محبت کرتا ہے ہرگز نہیں اس کو ظلم کرنے والوں سے بالکل محبت نہیں اور ایک غرض یہ بھی ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار کے صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے)

یہ سبق ہم نے قرآن کریم سے حاصل کیا ہے لیکن اس کی تفسیر ہمارے لیے کسی مولوی نے نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر خود اقبال نے کی تھی۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا انھیں نے

---

[1] یہ تمام اشارات خواجہ حسن نظامی مرحوم کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہیں (ابو سلمان شاہ جہان پوری)

ہمیں نہیں سکھایا تھا کہ ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

لیکن آج وہ ایمان ابراہیمی کا نسخہ ہمارے لیے تجویز نہیں کرتے بلکہ خود نمرود کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہم کو بھی حکم دیتے ہیں کہ کبھی سجدہ کرو کہ وہ سورج کو مشرق کی بجائے مغرب سے نہیں نکال سکتا مگر کچی ربوبیت اس کی شان بھی ہے۔ آج وہ ہماری نجات کو لجانب کے دستِ کرم میں بتاتے ہیں اور ہمیں ان کا دستِ نگر بناتے ہیں لیکن کیا انھیں نے ہمیں یہ سبق نہ سکھایا تھا کہ ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ، کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آ کر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

کیا انھیں نے ہمیں یہ امید نہ دلائی تھی کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور
خونِ گل پیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اگر یہ امیدیں بر نہ آئیں تو بے شک اس میں ہمارا بھی تصور ہو گا مگر کیا ہمارا شاعر ہر قصور سے بالکل مبرا اور معرّا ہے؟ جی نہیں چاہتا کہ اسے خود اس کا کلام یاد دلایا جائے جس سے اس نظم کی ابتدا ہوئی تھی، مگر جب اقبال جیسا سے گا رہی "محتاجِ ساقی" ہو جائے تو پھر بظاہر اس کی ضرورت ہے کہ اسے بھی یاد دلایا جائے کہ "شاعر" اور "شمع" میں کیا مکالمہ ہوا تھا۔

شاعر

دوش می گفتم بہ شمع منزل ویرانِ خویش
گیسوئے تو از پیِ پروانہ دارد شانہ

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے، نہ قسمتِ کاشانہ

مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طوافِ شعلہ ام بالے نزد پروانہ

می تپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من
بر نمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانہ

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کز مکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

کیا آج بھی شاعر کی یہی حالت نہیں ہے تو پھر کیا ہم شمع کے اس جواب کو بھی صحیح سمجھیں۔

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغام اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا زیبا ہے تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ میں ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اے دُرِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

شوقِ بے پروا گیا فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میں نہیں کہتا کہ ؎

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتشِ بجام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

میں تو آج بھی اقبال اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا تو آتش بجام آکر تو دیکھ، کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں، تو بادِ بہاری کا پیام تو بھیج، یہ خزاں دیدہ چمن پھر ایک بار اپنی بہار دکھادے گا، مانا کہ آخر شبِ بسمل کی تڑپ دید کے قابل تھی مگر تو پھر بالائے بام آکر تو دیکھ ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لیے بہت بسمل باقی ہیں، ابھی تک شعلہ نہیں بجھا ہے مگر وہ سودائی کہاں ہے جو سوزِ تمام کا سودائی ہو پھول ہرگز بے پروا نہیں تو گرمِ نوا تو ہو، یقیناً کارواں گم کردہ راہ ہے اور کارواں والے اس قدر نیند کے ماتے ہیں کہ اس خارزار میں پڑے سو رہے ہیں لیکن آوازِ درا بھی تو آج کسی کو سنائی نہیں پڑتی۔ کیا تو نے ہی ہمیں عرفی کا یہ شعر یاد نہیں دلایا تھا کہ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی ۔۔۔ حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

کیا آج عرفی کی تربت سے یہی صدا نکل رہی ہے کہ

"شکوۂ اہلِ جہاں کم گو"

بس یا تو خاموش رہ یا پھر وہی راگ الاپ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ۱۹۲۲ء تک دیپک کا کام دیا تھا اور ہر قلب میں ایک آگ سی لگادی تھی مگر شرط خود تیری اپنی مقرر کردہ ہے ؎

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو ۔۔۔ خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

تعجب ہے کہ آج تو بھی لالہ جی کے خوف سے او گلوی صاحب کی گود میں گھسا جاتا ہے کیا تو ہی وہ اقبال نہیں جس نے ہم کو بتایا تھا کہ ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر ۔۔۔ از نبی تعلیم لاتحزن بگیر
قوتِ ایماں حیات افزایدت ۔۔۔ وردِ لاخوف علیہم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود ۔۔۔ قلبِ او از لاتخف محکم بود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است ۔۔۔ کاروانِ زندگی را رہزن است

بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

تو نڈر ہو کر مسلمانوں کو پھر بیدار کر، اور مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوؤں کو بھی، جو ہم سے بھی زیادہ خوف زدہ ہیں۔ فقط مسلم لیگ ہی کو نہ جگا بلکہ کانگریس کو بھی ہوشیار کر۔ ع
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

تاریخِ ملتِ اسلامیہ ہندوپاکستان کے ایک اہم دور کی سب سے مستند کتب حوالہ

مولانا محمد علی
اور
اُن کی صحافت

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے قلم سے

مولانا محمد علی شاعر، ادیب، خطیب، سیاستدان سب کچھ ہی تھے

لیکن

اُن کے ذہنی و فکری کمالات کا اظہار سب سے زیادہ صحافت کے میدان میں ہوا ہے

کامریڈ اور ہمدرد کے اجراء کی تاریخی سرگذشت

کامریڈ اور ہمدرد میں کام کرنے والے اہلِ قلم اور کارکنوں کے حالات کا مُرقع،

اور

کامریڈ اور ہمدرد کے مقالاتِ افتتاحیہ اور ہمدرد کے تمام اہم مضمون کے اشاریے!

اس آئینے میں آپ وقت کے اہم مسائل کا عکس اور ہندو مسلم سیاسی رہنماؤں کے افکار و سیرت کے حقیقی خدوخال دیکھ سکیں گے
شعر و ادب، تذکار و سوانح، صحافت و سیاست اور تاریخِ ملک و قوم کے ہر پہلو اور

مولانا محمد علی کے افکار و سوانح پر تصنیف و تحقیق
کے لیے حوالہ کی ایک ناگزیر کتاب

کاغذ سفید — مجلد — صفحات ۲۹۶ — قیمت ۶۰ روپے

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۰۸۶ الحیدری کراچی

سرسیّد کی کہانی

ان کی اپنی زبانی!

مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں مذہب، سیاست،
تعلیم اور زبان کے سب سے بڑے محسن کی
خود کشیدہ تصویر

الطاف حسین حالی کی روایت کے مطابق
سرسیّد کے اعترافات

ضیاء الدین لاہوری کی محققانہ تالیف جسے ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے طویل مقدمہ نے
سہ آتشہ بنا دیا ہے!

آپ اس تلخابہ شیریں کی لذت کو مدت دراز تک
فراموش نہ کر سکیں گے!

طباعت آفسٹ | جلد خوبصورت | صفحات ۱۱۲ | قیمت ۱۵ روپے

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان
۱۸۰۸۶ کراچی ۳۲

البیرونی اور جغرافیۂ عالم

مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری تصنیف

جو

مولانا کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات سے دستیاب ہوئی

البیرونی کی علمی شخصیت محققانہ حیثیت اور فنِ جغرافیہ میں اس کی مجتہدانہ نظر و بصیرت پر

مولانا آزاد کے قلم سے دلفریب تبصرہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کا مرتبہ پاکستانی ایڈیشن

متعدد اضافوں کے ساتھ

۱- پیش لفظ: جس میں مولانا آزاد کی اردو زبان کی خدمات کی تاریخ، لسان الصدق اور الہلال کی خدمات اور مولانا کے طرزِ املا و کتابت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۲- مقدمہ: "مولانا ابوالکلام آزاد" کے عنوان سے مقدمہ جس میں البیرونی اور جغرافیہ سے مولانا کی دلچسپی اور مطالعے کی پوری تاریخ ہے، طرزِ نگارش کی دلآویزیوں پر تبصرہ اور مولانا کی تحریر کے جلی و خفی خصائص کی نشاندہی کی گئی ہے ۳- اضافہ: ہندوستان اور حکیم ابوریحان بیرونی کے عنوان سے مولانا کا ایک نایاب مضمون اور دیگر تحریرات ۴- اصطلاحاتِ علمیہ: کتاب میں مستعمل علمی اصطلاحات کی تخریج و ترتیب ۵- تصحیح: مولانا آزاد کے طرزِ املا کے مطابق متن کی تصحیح کا اہتمام ✻ کاغذ سفید ✻ طباعت آفسٹ ✻ قیمت ۱۲۱ روپے (پیپر بیک) ۲۵ روپے مجلد

افاداتِ آزاد

مذہبی اور ادبی استفسارات کے جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد

کے قلم سے اور اُن کی جانب سے

مولانا کے علمی تبحر دینی بصیرت، مجتہدانہ نظر اور تفقہ فی الدین کے شاہکار ملفوظات و جوابات

حصہ اوّل (دینی)

ایمان و عقائد، عبادات، نکاح و طلاق، قرآن و حدیث، فقہ، مسائل جدیدہ، تصوف، تعلیم و اصلاح، رسوم، قادیانیت وغیرہ عنوانات کے ذیل میں سینکڑوں مسائل کے متعلق محققانہ، فکر انگیز اور ایمان پرور ملفوظات و جوابات

حصہ دوم (ادبی)

ادب، تاریخ، فلسفہ، تہذیب، ثقافت اور بہت سے مسائل و افکار اور شخصیات و موضوعات کے بارے میں مولانا آزاد کے تین سو سے زیادہ نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد کے نادر افادات کا یہ مجموعہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے ذوقِ تحقیق کا نتیجہ اور حسنِ ترتیب و تدوین کا نمونہ ہے

اس مجموعۂ افادات کی تصحیح مولانا غلام رسول مہرؔ نے فرمائی ہے

اور

اس پر ایک عالمانہ و ادیبانہ مقدمہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں کے قلم سے ہے!

سفید کاغذ ——— آفسٹ کی چھپائی ——— قیمت ۲۵/ روپے

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، ۱۸۰۸۶ الحیدری، کراچی ۳۳

پروفیسر شفقت رضوی کے قلم اور ذوق تالیف و تحقیق کے

دو شاہکار

سراج اورنگ آبادی

(شخصیت اور فکر و فن)

دکن کے نامور اردو شاعر پر پہلی محققانہ تصنیف

سراج کی زندگی اور فکر و فن کے جلی و خفی گوشوں پر قیمتی مواد، ناقدانہ نظر، شگفتہ زبان اور دلکش اسلوبِ بیان

کاغذ سفید قیمت ۲۵ روپے

اردو کے یورپین شعراء

اردو شاعری میں اہل یورپ کی فکر و کاوش، ادبی خدمات، سوانح اور منتخب کلام کا

ایک حسین اور دلآویز گلدستہ

اردو کی ادبی تاریخ کا یہ گمشدہ باب پروفیسر سید شفقت رضوی کے ذوقِ تالیف و تحقیق کا شاہکار ہے۔ قیمت ۲۰ روپے

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان

کراچی ۳۳

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان ۱۸۰۸۶، کراچی ۳۲

علامہ اقبال اور مولانا محمد علی

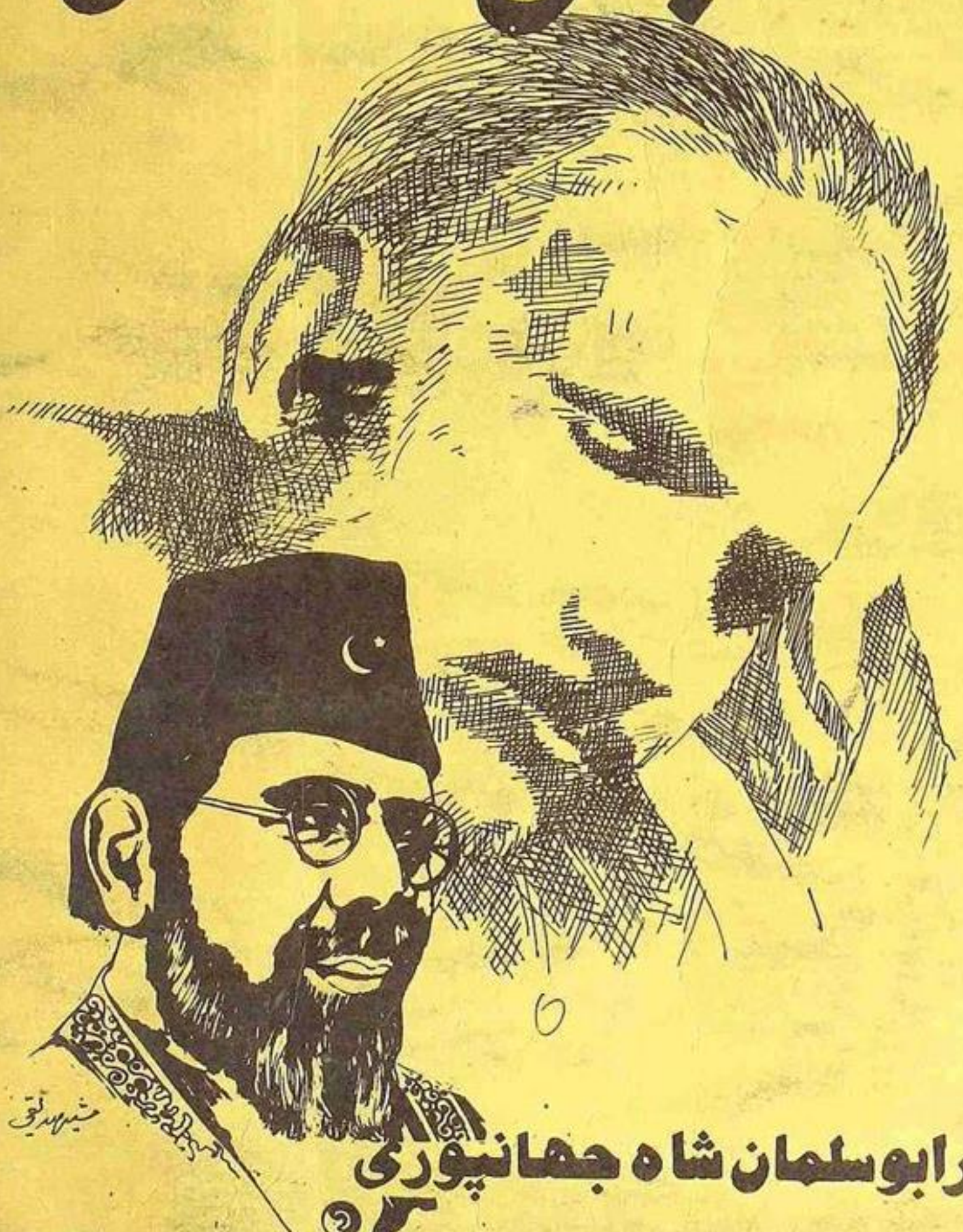

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری